خاکے

عبدالمجیب سہالوی

خاکے

عبدالمجیب سہالوی

اس کتاب کے مندرجات سے
اترپردیش اردو اکاڈمی کا متفق ہونا ضروری نہیں

ناشر :- عبد المجیب سہالوی۔ سہالوی ہاؤس
کھدرا سیتاپور روڈ۔ لکھنؤ
طابع :- ندائے حق پریس حضرت گنج لکھنؤ
سنہ اشاعت :- سنہ ۱۹۹۰ء
تعداد اشاعت :- چھ سو (۶۰۰)
قیمت :- سات روپیہ
کتابت :- حبیب علی عباسی کھدرا۔ لکھنؤ

ملنے کا پتہ :-
نسیم بک ڈپو لاٹوش روڈ۔ لکھنؤ
دانش محل امین الدولہ پارک۔ لکھنؤ

یہ کتاب اترپردیش
اردو اکاڈمی کے
مالی تعاون سے شایع
ہوئی

انتساب

بھائی ڈاکٹر سعید الحبیب قدوائی مرحوم

کے نام

فہرست مضامین

پیش لفظ

یہ خاکے جو میں نے لکھے ہیں اپنے جاننے والوں اور جان پہچان کے لوگوں کے ہیں اس لیے وہ فرضی نہیں بلکہ اصلی ہیں۔ ہاں ان میں سے کچھ لوگوں کے نام فرضی ہیں ان میں سے اکثر خاکے قومی آواز میں شائع ہو چکے ہیں چنانچہ سید ناصر علی (اخبار کے ہاکر) کا خاکہ جب قومی آواز میں شائع ہوا تو مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے مجھے خط لکھا اور خاکے کی تعریف کی۔ مولانا کے خط سے میری بڑی ہمت افزائی ہوئی اور میں نے مزید خاکے لکھے۔ اس کتاب میں سب خاکے نہیں شامل کیے گئے ہیں بلکہ صرف وہی خاکے شامل کیے گئے ہیں جن کا اس کتاب میں گنجائش نکلی۔

اگر اللہ نے موقعہ دیا اور میری صحت اچھی رہی تو ذہن میں کچھ اور جاننے والے ہیں جن کے خاکے لکھنا چاہتا ہوں۔ قارئین کی دعاؤں کا طالب۔

عبدالمجیب سہالوی

رئیس احمد جعفری

جب دانش محل کے مالک نسیم احمد صاحب نے یہ جانکاہ خبر سنائی کہ بھائی رئیس احمد جعفری کا حرکت قلب بند ہو جانے سے لاہور میں اچانک انتقال ہو گیا تو دل کی عجیب حالت ہو گئی پرانی یادیں زخموں کی طرح یکدم تازہ ہو گئیں اور آج سے لگ بھگ چالیس سال پہلے کا وہ منظر آنکھوں کے سامنے آگیا جب دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ہم نے انھیں پہلی بار دیکھا تھا۔

غالباً جولائی کا مہینہ تھا چار بج چکے تھے میں اور میرے بڑے بھائی عبدالحسیب صاحب (مرحوم) گھر کے چھٹنے کے غم میں بورڈنگ کے لڑکوں کے ساتھ فیلڈ میں جا کر کھیلنے کے بجائے کچھ سہمے ہوئے برآمدے میں ادھر ادھر پھر رہے تھے۔ کہ پورٹیکو کی دائیں جانب والے برآمدے میں ایک چارپائی پر ہمارے بڑے بھائی کی عمر کے ایک صاحبزادے رونی صورت

بنائے لیے تھے ان کا داخلہ آج ہی ہوا تھا اس لحاظ سے ہم لوگ عمر میں کم ہونے کے باوجود ان سے سینیر تھے شاید اسی لیے انھوں نے ہم لوگوں کو اپنی طرف آتے دیکھ کر پہلے اسلام علیکم کیا اور اٹھ کر بیٹھ گئے۔ ان کا داخلہ بھی پہلے ہی درجہ میں ہوا تھا۔ تو گرفتار ہونے کے وجہ سے ہم نے ایک دوسرے سے ایک قسم کی قربت محسوس کی اور ساتھ بیٹھ کر ہم غلط کرنے لگے۔

اتنے لمبے عرصے اور تیزی سے بدلتے ہوئے حالات نے ہم لوگوں کو اب کتنا دور اور کتنا بدل دیا اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ جن کی ہمیں منٹ منٹ بھر کی خبر رہتی تھی۔ ان کی موت کی خبر بھی ہمیں چار پانچ دن بعد ملی۔ صنعتی دور کی جان لیوا دوڑ دھوپ نے ہمیں اتنی فرصت بھی نہ دی کہ ہم خط کے ذریعہ ہی ایک دوسرے کی خیر خبر معلوم کر سکتے لیکن موت کی خبر سنتے ہی جیسے ایک جھٹکے کے ساتھ درمیان میں پڑے ہوئے امتداد زمانہ کے پردے آنکھوں کے سامنے سے یکدم ہٹ گئے اور ندوہ کے برآمدے میں متعدد کتابوں اور بے شمار ناولوں کے مصنف جھکے ہوئے شانوں والے بوڑھے رئیس احمد جعفری نہیں بلکہ مسیں بھیگتی ہوئی لمبا قد موٹا جسم پھولے پھولے گال منجھولی گول گہرائی میں چمکتی ہوئی آنکھیں، چوڑی پیشانی

اونچی اور قدرے موٹی ناک اور گیہواں رنگ والے نو وارد طالب علم چارپائی پر بیٹھے ہم لوگوں سے باتیں کرتے نظر آنے لگے۔

میرے بڑے بھائی عبدالحبیب صاحب اور رئیس احمد جعفری صاحب کو کھیل سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی دونوں درجہ میں ساتھ رہنے کے علاوہ چار بجے کے بعد بھی خالی وقت میں ایک ساتھ رہتے اس لیے دونوں بہت جلد گھل مل گئے اور گہری دوستی ہوگئی بڑے بھائی رئیس احمد صاحب کی دوستی کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کا کلاس فیلو ہونے کے باوجود میرا درجہ چھوٹے بھائی کا قرار پاگیا اس کے بعد جب تک ساتھ رہا انھوں نے اس رشتے کو بڑی وضع داری سے نباہا اور میں نے بھی ان سے انتہائی بے تکلف ہوجانے کے باوجود حفظ مراتب کا ہمیشہ خیال رکھا۔

بڑے بھائی عبدالحبیب صاحب کچھ عرصے کے بعد ندوہ سے طبیہ کالج علی گڑھ چلے گئے اور اب میں براہ راست رئیس صاحب کے چارج میں آگیا۔

اس زمانہ میں ندوہ میں نہ تو شبلی ہوسٹل بنا تھا نہ مہمان خانہ اور نہ مسجد بلکہ بڑی عمارت ہی میں تعلیم بھی ہوتی تھی اور طلباء رہتے بھی تھے۔

میں اور رئیس صاحب گیٹ کے دائیں جانب والے کمروں میں رہتے تھے۔ یہ بات میرے لیے اور رئیس صاحب دونوں کے لیے اچھی ہی ہوئی کیوں کہ اس طرف کے کمروں میں رہنے والے طلباء کو شیر کی گرج تو سنائی دیتی تھی لیکن وہ ہر وقت اس کے پنجے میں نہ رہتے تھے۔ یہ شیر بورڈنگ کے اتالیق مولانا شبلی مدرس تھے جو گیٹ کے بائیں جانب والے کمروں میں رہتے تھے وہ اپنے لباس کی سادگی کے باوجود اپنی گھنیری داڑھی، رعب دار سیاہ چمکتے ہوئے چہرے، لمبے قد بھاری بھرکم جسم اور گرجدار آواز کی بنا پر وہ شیر ببر معلوم ہوتے تھے اور جب وہ اپنے کمرے سے گرجتے تو ندوہ کی پوری عمارت گونج اٹھتی اور ہم لوگوں کے دل ہل جاتے۔

ان کا معمول تھا کہ وہ ہر نماز کے وقت پورے بورڈنگ ہاؤس کا اس لیے چکر لگاتے کہ دیکھیں کون لڑکا نماز پڑھنے نہیں گیا ہے اور جب کسی کو سوتے، کھیلتے یا گپیں مارتے پا جاتے تو اس کی پٹائی بھی کر دیتے مولانا کے پاؤں میں انگوٹھا تھا اس لیے وہ ہمیشہ ہر موسم میں چپل پہنتے تھے اور پاؤں زمین سے گھسلا کر چلتے ہم لوگ ان کی چال اتنی پہچان گئے تھے کہ سنتے ہی سمجھ جاتے تھے کہ شیر آ رہا ہے اور چارپائی کے نیچے بچھے فرش پر سانس روک کر دبک جاتے لیکن جیسے ہم ان کی چال پہچان گئے تھے اسی طرح وہ بھی ہماری چالوں سے واقف ہو گئے تھے اس لیے وہ صرف کمرے

کا چکر لگا کر ہی نہ چلے جاتے بلکہ چار پائی کے نیچے بھی جھک کر دیکھ لیتے ان کی موجودگی کا احساس ہوتے ہی ہمارے ہوش اڑ جاتے اور ہم بدحواس ہو کر بھاگتے لیکن بھاگتے بھاگتے مولانا کا ایک آدھ ہاتھ تبرکاً پڑ ہی جاتا۔

مولانا کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنے ہاتھ سے نکل جانے والے شکار کا نہ تو پیچھا کرتے اور نہ بعد کو پوچھ گچھ کرتے بلکہ شاید اس کے پھرتیلے پن کی دل ہی دل میں داد دیتے کیونکہ مولانا سیدھے سادھے مفلس لڑکوں کے مقابلہ میں شریر تر تیز لڑکوں سے زیادہ خوش رہتے۔

رئیس صاحب مولانا کے متعلق یہ کہا کرتے تھے کہ مولانا ناریل کی طرح اوپر سے سخت اور اندر سے نرم ہیں۔ واقعی مولانا کا یہی حال تھا وہ فرائض کی ادائیگی کے لیے محتسب جیسی سختی برتتے لیکن بیماری آزاری کے وقت لڑکوں کے ساتھ ماں جیسی محبت بھی کرتے۔ شروع شروع میں ایک آدھ پٹائی کے بعد ہم لوگ ہوشیار بھی ہو گئے اور رفتہ رفتہ مکتب کے معمولات کے عادی بھی۔

رئیس احمد جعفری کی تربیت ادب و شعر کی گود میں ہوئی تھی وہ ریاض خیرآبادی کے نواسے تھے اور والد کے انتقال کے بعد وہ ان کی والدہ اور ان کے بڑے بھائی عقیل احمد جعفری ریاض ہی

صاحب کے ساتھ رہتے تھے۔ ندوہ میں آنے کے بعد انھیں اپنے ادبی ذوق کو پروان چڑھانے کے لیے زیادہ وسیع میدان ملا۔ وہ اپنا زیادہ تر وقت کتب بینی ہی میں صرف کرتے مگر درسی کتابیں بہت کم پڑھتے

ابھی وہ درجہ اول ہی میں تھے کہ طلباء کی انجمن الاصلاح کی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے وہ بڑی پابندی سے روزانہ عصر کی نماز کے بعد انجمن الاصلاح کی لائبریری میں جاتے، ریڈنگ روم میں اخبارات پڑھتے اور کمرے میں پڑھنے کے لیے کتابیں ساتھ لے آتے وہ تیز پڑھتے بھی تھے اور لکھتے بھی تھے لکھنے کے جوہر ابھی کھلے بھی نہ تھے لیکن پڑھنے کا یہ حال تھا کہ موٹی سی موٹی کتاب وہ دو ہی دن میں ختم کر کے واپس کر آتے تھے۔

انجمن الاصلاح کی جانب سے ہر جمعرات کو مختلف موضوعات پر ڈبیٹ ہوا کرتے تھے رئیس صاحب نے داخلہ کے چند ہی ماہ بعد سے ان مباحثوں میں شرکت شروع کردی تھی اور چھوٹے درجے کے طالب علموں میں وہ اچھے مقرروں میں سمجھے جانے لگے۔

انجمن الاصلاح کی جانب سے ایک ہاتھ سے لکھا ہوا اردو ماہنامہ نکلتا تھا جس کا نام غالباً الاصلاح تھا۔ رئیس صاحب دوسرے تیسرے درجہ میں تھے کہ انھوں نے اس پرچے میں مضامین لکھنے شروع کردیئے

تھے۔ اس کے بعد وہ اس کے اڈیٹر بھی ہو گئے تھے۔

انجمن الاصلاح ایک طرح سے وہاں کے طلبا کے لیے ذہنی تربیت گاہ کی حیثیت رکھتی تھی جہاں طلباء کو اپنے ذوق کے مطابق سرگرمیوں میں حصہ لینے کا موقع ملتا تھا۔ سچ یہ ہے کہ ہم لوگوں کو اردو ادب سے جو کچھ لگاؤ پیدا ہوا وہ انجمن الاصلاح ہی کی دین ہے۔

رئیس صاحب درجہ چہارم پاس کرنے کے بعد ہی طلبا کے لیڈروں میں شمار کیے جانے لگے تھے حالانکہ ان میں لیڈروں والی سوائے اس کے اور کوئی بات نہیں پائی جاتی تھی کہ اچھا لکھ اور بول لیتے تھے۔ مزاج کی سادگی اور اپنی طرف سے لاپرواہی بد نمائی کی حد تک پہونچی ہوئی تھی۔ وہ شیروانی کے پورے بٹن کھولے اور ازار بند لٹکائے جھومتے ہوئے چلتے تو جالب صاحب اڈیٹر ہمدم کی یاد تازہ ہو جاتی انھیں بیڑی کا بے حد شوق تھا کبھی کبھی سگریٹ بھی پی لیتے لیکن سیری اور سرور صرف بیڑی ہی پی کر حاصل ہوتا۔ انھیں ندوہ میں دو ہی چیزوں کی تکلیف تھی بیڑی اور بوٹی کی، انھیں نہ تو یہاں آزادی سے بیڑی پینے کو ملتی اور نہ جی بھر کر بوٹی کھانے کو۔ انھیں ندوہ کی خمیری روٹیاں بہت پسند تھیں لیکن شوربے کی زیادتی اور بوٹیوں کی کمی کی ہمیشہ شکایت رہی۔

رئیس صاحب کرسی پر بیٹھ کر بہت کم پڑھتے خیر گرمیوں میں تو کبھی

کبھی کرسی پر بیٹھ کر پڑھا بھی کرتے لیکن سردی کے موسم میں وہ کرسی کے پاس تک نہ جاتے اور چارپائی پر لحاف میں گٹھری بنے ہوئے اس مزے میں پڑھتے نظر آتے کہ جیسے کوچ پر لیٹے پڑھ رہے ہوں ایک تو ماشاء اللہ سے خود ہی وزن دار آدمی تھے اس پر اخبارات رسائل اور کتابوں کے بوجھ سے چارپائی کے انجر پنجر اور ڈھیلے ہو جاتے۔ ہم لوگ اگر کبھی سعادت مندی میں ان کا بستر درست کرنے اور کتابیں میز پر لگانے لگتے تو وہ منع تو نہ کرتے لیکن خوش بھی نہ ہوتے اور دوسرے دن پھر کتابیں اور رسالے ان سے بغل گیر نظر آتے۔

حساب کتاب کر نا وہ جانتے ہی نہ تھے سودا خریدنے میں بھی انھیں بڑی الجھن ہوتی تھی اور یہ کام اکثر وہ ہمیں لوگوں سے لیا کرتے تھے لیکن عجیب بات یہ تھی لاا‌ؤ بالی پن کے باوجود چیز ہمیشہ اعلا درجہ کی پسند کرتے۔

وہاں طلبائے کے لیڈر لوگ عام طور پر ذرا اپنے کو لیے دیئے رہتے تھے ہنسی مذاق اور کسی ایکٹی وٹی میں کم شرکت کرتے لیکن رئیس صاحب طلبائے کے مسلمہ لیڈر ہونے کے باوجود اس کا زیادہ لحاظ نہ کرتے چنانچہ گرمیوں کا زمانہ تھا اور اب ہم لوگ شبلی ہوسٹل کی نو تعمیر عمارت میں منتقل ہو چکے تھے۔ مولانا شبلی مکارم نگر کی طرف والے بازو میں رہتے تھے اور رئیس احمد صاحب اور رشید اختر ندوی کیننگ کالج ہوسٹل

کی طرف والے بازو میں رہتے تھے ہم اگرچہ رہتا تو مولانا شبلی کے زیر سایہ تھا لیکن جب ہم لوگوں کو کوئی ایکٹی وٹی کرنے کا دل چاہتا تو ہم اسی طرف چلے جاتے ۔

رات کے گیارہ یا بارہ بجے ہوں گے غالباً سالانہ امتحان کی تیاری ہو رہی تھی ۔ ہم لوگ ہوسٹل کے سامنے والے وسیع میدان میں جہاں اب قلم، باغ ہے پلنگوں پر لیٹے یا بیٹھے پڑھ رہے تھے ۔ پڑھتے پڑھتے دل بہلانے کا دل چاہا اور میرے کمرے کے ساتھی ذکی صاحب جو اس وقت ہاکی کیپٹن تھے اور کافی دلچسپ آدمی تھے رئیس صاحب کی طرف ٹہلتے ہوئے چلے راستے میں ہم لوگوں نے دیکھا کہ رشید اختر صاحب کی لالٹین تیزی سے جل رہی ہے اور وہ خود کتاب سینے پر رکھے خراٹے لے رہے ہیں ۔ کون ایسا بدذوق ہوگا جو اپنے کسی ساتھی کو اس عالم میں دیکھے اور اسے کوئی ایکٹی وٹی کرنے کا دل نہ چاہے چنانچہ ہم لوگ رئیس صاحب کے پاس پہونچے اور اپنے نیک ارادے کا اظہار کیا انھوں نے نہ صرف یہ کہ ہماری ہمت افزائی کی بلکہ اس کارخیر میں سوائے عملی مدد کے ہر قسم کی اخلاقی امداد دینے پر آمادہ ہو گئے اور رشید اختر صاحب کا جنازہ اٹھانے کے لیے دو لڑکے اور تلاش کر دیئے اور رشید اختر صاحب کی چارپائی اپنے کاندھوں پر تو نہیں رکھی لیکن حق دوستی

ادا کرنے کے لیے ہاتھ لگا کر ان کا جنازہ ہم لوگوں کے کاندھوں تک پہونچا دیا۔ اور دعائے مغفرت کرتے ہوئے جنازے کے ساتھ ہو لیے ابھی جنازہ مسجد سے کافی دور تھا کہ مردے نے کروٹ لی اور لاحول پڑھتا ہوا اٹھنے لگا۔ لاحول سن کر ہنسی کے مارے ہم شیطانوں کا برا حال ہو گیا۔ اور میت مع چارپائی کے میدان میں چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے شامت اعمال راستے میں عبدالسلام صاحب قدوائی ندوی سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ انھوں نے ہم لوگوں کو بڑی خشمگیں نگاہوں سے دیکھا اور ناصح خشک کے فرائض انجام دیتے ہوئے اتنی زور سے گلے لگایا کہ وہ نصیحت بھول کر اپنی پسلیوں کی خیر منانے لگے۔

اب ہم لوگ درجہ ششم میں پہونچ چکے تھے اور رئیس صاحب انجمن الاصلاح کے ناظم اور میں نائب ناظم منتخب ہو گئے اب رئیس صاحب نے درسی کتابیں بھی توجہ سے پڑھنی شروع کر دیں۔ حدیث سے انھیں خاصا لگاؤ تھا اور خوش قسمتی سے اس زمانے کے مشہور محدث اور ندوہ کے مہتمم مولانا حیدر حسن صاحب ٹونکی ہم لوگوں کے استاد تھے اور ہم لوگوں کے کھلنڈرے پن کے باوجود ہم پر خاص نظر عنایت رکھتے تھے انھوں نے رئیس صاحب کا اس طرف رجحان دیکھ کر کالج کے اوقات کے علاوہ بھی حدیث کا درس دینا شروع کر دیا

نیا موڑ :۔

چھٹا درجہ پاس کرکے ہم لوگ ساتویں درجہ میں پہونچے یہ سال ہم لوگوں کی زندگی میں ایک اہم موڑ کا پیش خیمہ تھا۔ مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی درجہ ہشتم کے طالب علم ہونے کی بنا پر رئیس صاحب سے صرف ایک سال سینیر تھے لیکن وہ شاید سینیر پیدا ہی ہوئے تھے کیوں کہ انھیں کھیل کود مذاق ہنسی میں شریک ہوتے ہم کیا غالباً ان کے گھر والوں نے بھی نہ دیکھا ہوگا عادات، اطوار اور صورت شکل کے لحاظ سے وہ کافی ثقہ آدمی تھے لیکن ذہنی طور پر بڑے ترقی پسند اور روشن خیال تھے اور بقول شخصے

مرا مزاج لڑکپن سے لیڈرانہ تھا

اس لیے ندوہ میں آنے کے کچھ ہی عرصے بعد وہ بچارے اصلاح ندوہ کے غم میں گھلنے لگے۔ رئیس صاحب سے ان کی دوستی انجمن الاصلاح کی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی بنا پر ہوئی اور تھوڑے ہی دنوں میں کافی گہری دوستی ہوگئی اور جب تک رئیس صاحب پاکستان نہیں چلے گئے ایک دوسرے کے ساتھ شیر و شکر کی طرح رہے رئیس صاحب تو ان کی جدائی ایک منٹ کے لیے بھی برداشت نہ کر سکتے اور جہاں جاتے انھیں پکڑے لے جاتے۔ مولانا میں ذہنی

اعتبار سے کٹھ ملاپن بالکل نہ تھا اس لیے انھیں اصلاح ندوہ کے سلسلہ میں جو کچھ توقع تھی وہ ہم لوگوں کی جرأتِ رندانہ سے ہی تھی اس لیے وہ ہم لوگوں سے زیادہ قربت محسوس کرتے اور بڑی محبت کرتے ان کے بے لوث جذبہ اور اپنے مشن سے ان کی لگن نے غیر شعوری طور پر رفتہ رفتہ ہم لوگوں پر بھی اثر کرنا شروع کیا اور ہم لوگ ان کے اصلاحی پروگرام کو سنجیدگی سے سننے لگے۔ آزادی اور اپنے حقوق کا اس وقت ملک کی پوری فضا میں پایا جاتا تھا اس کا اثر طلباء پر ہونا لازمی تھا۔ اس لیے نامعلوم طور پر ندوہ کے ارباب حل و عقد اور طلباء میں ایک قسم کی کشمکش پائی جاتی تھی۔

اتفاقاً اسی درمیان ایک معمولی سا واقعہ پیش آگیا جس نے اس دبی ہوئی کشمکش کو ابھار دیا اور عین سالانہ امتحان کے دوران .... اسٹرائک کی نوبت آگئی۔ دارالعلوم بند کر دیا گیا۔ کچھ دنوں تک ہم لوگ چندہ وغیرہ کر کے طلباء کے کھانے کا انتظام کرتے رہے اور انھیں روکے رکھا لیکن کب تک آخر کار طلباء کی اس اسٹرائک کا بھی وہی حشر ہوا جو ہوتا چلا آیا ہے یعنی اسٹرائک ناکام ہو گئی اور لیڈروں کو نکال دیا گیا۔

اسٹرائک کے لیڈروں کا نکالا جانا دارالعلوم کے نظم و ضبط

کے لیے ضروری تھا اس لیے ہم لوگوں کو نکال تو دیا گیا لیکن ہمارے اور ہمارے مشفق استادوں کے درمیان جو تعلقات تھے ان میں کوئی فرق نہیں آیا ہڑتال کے دوران کبھی استادوں نے شفقت کا اور طلباء نے حفظ مراتب کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ طلباء نے نہ کبھی مردہ باد کے نعرے لگائے اور نہ ذمہ داروں نے طلباء کو بورڈنگ سے زبردستی نکلوانے کی کوشش کی۔

ہڑتال کی ناکامی کے بعد عبدالسلام صاحب قدوائی، رئیس صاحب اور میں نے جامعہ ملیہ جانے کا ارادہ کر لیا۔ اسٹرائک کے ایک سرگرم لیڈر ہمارے محترم دوست مولانا عبدالحئی بھی مجھے یاد نہیں کہ کس کام سے بہر حال اسٹرائک ہی کے سلسلہ میں ہم لوگوں کو ان سے ملنے کی ضرورت محسوس ہوئی وہ اس زمانہ میں اپنے وطن ٹڈیل ضلع بارہ بنکی میں تھے۔ عبدالسلام صاحب رئیس صاحب اور میں ان سے ملنے کے لیے بارہ بنکی آئے۔ گرمیوں کا زمانہ تھا دھوپ سخت اور بیٹریل کا راستہ کٹھن تھا۔ بارہ بنکی سے بیٹریل کی مسافت تو زیادہ نہیں لیکن اس زمانہ میں وہاں جانے والی کچی سڑک اس حالت میں تھی کہ کوئی یکہ والا ہم لوگوں کو وہاں لے جانے کے لیے تیار نہ ہوا۔ بمشکل ایک یکہ والا تیار ہوا جس کا یکہ مضبوط اور گھوڑا بھی تگڑا تھا۔

یکے کے ایک پر پر رئیس صاحب اور دوسرے پر میں اور عبدالسلام

صاحب دونوں طرف کا وزن برابر رکھنے کے لیے بیٹھے ۔ ابھی ہم لوگ تھوڑی ہی دور چلے تھے کہ ایک طرف گہری اور دوسری طرف انتہائی اونچی لیک میں جاتے ہی یکّے کا ایک حصہ آسمان پر اور دوسرا حصہ تحت الثریٰ میں پہونچ گیا اس کے بعد رئیس صاحب ہم دونوں پر اس زوروں سے لڑھک کر گرے کہ اپنے ساتھ ہم دونوں کو بھی زمین پر لیتے آئے خیریت ہوئی کہ زمین بالو والی تھی اس لیے زیادہ چوٹ نہیں آئی صرف رئیس صاحب کے پائجامہ کا ایک پائنچا پھٹ گیا ۔ جھاڑ پونچھ کر میں اور رئیس صاحب پھر یکّے پر بیٹھنے کے لیے تیار ہو گئے لیکن مولانا عبدالسلام صاحب کسی طرح یکّے کے قریب آنے کے لیے تیار نہ ہوئے اور ہم لوگوں کو یکّے پر بیٹھنے کے ہولناک نتائج سے آگاہ کرنے کا فرض مستعدی سے دیتے گئے ایک طرف مولانا یکّے کے قریب جانے پر تیار نہ تھے دوسری طرف رئیس صاحب چلچلاتی دھوپ میں اس ریگزار کے اندر پیدل چلنے کے لیے کسی طرح آمادہ نہ ہوتے ایسی صورت میں میں نے یہی مناسب سمجھا کہ اپنے ساتھ یکّے والے کا وقت کیوں ضائع کیا جائے اور اسے کرایہ دے کر رخصت کر دیا ۔ اس کے چلے جانے کے بعد رئیس صاحب کو مولانا پر غصہ اتارنے انھیں دلو چنے اور جھنجھوڑنے کی پوری آزادی مل گئی اور پھر ریل پہونچتے پہونچتے رئیس صاحب نے اپنے ساتھ مولانا کا بھی برا حال کر دیا ۔

عبدالحئی صاحب کے گھر پہونچتے پہونچتے ایک بج گیا۔ شومی قسمت کہ وہاں جاکر معلوم ہوا کہ عبدالحئی صاحب بارہ بنکی شہر گئے ہیں یہ خبر سن کر ہم لوگوں کے تکان میں اور اضافہ ہو گیا۔ لیکن صاف ستھرے ہوا دار کمرے میں پہونچ کر اور ٹھنڈا شربت پی کر ہم لوگوں کے حواس بجا ہوئے ہم اور رئیس صاحب چارپائیوں پر لیٹ گئے اور مولانا کھانے کا انتظار کیے بغیر ظہر کی نماز کے لیے وضو کرنے لگے۔ وضو کرنے کے بعد مولانا اپنی عینک کے خانے کی گمشدگی کا اعلان کرنے کے بعد اس کی تلاش میں ہمارے بستر اور تکیوں کی تلاشی مستعدی سے لینے لگے۔ اتنے میں عبدالحئی صاحب کا لڑکا جو میزبانی کے فرائض انجام دے رہا تھا کمرے میں آیا لیکن مولانا کو مشغولیت کی وجہ سے اس کے آنے کا احساس نہ ہوا اس نے کمرے میں آکر کہا خانا (کھانا) ابھی وہ لاؤں بھی نہ کہہ پایا تھا کہ مولانا نے بڑی بے تابی سے کہا کہاں ہے؟ اور جب مولانا کو یہ احساس ہوا کہ خانہ نہیں کھانا لانے کو کہہ رہا ہے تو بڑی معصومیت سے منہ پھیر کر پھر اپنی عینک کا خانہ اس طرح تلاش کرنے لگے جیسے کہ کچھ ہوا ہی نہیں لیکن ہم لوگوں کا مارے ہنسی کے برا حال ہو گیا۔ اور تھوڑی دیر تک ہم لوگ اسے کوئی جواب نہ دے سکے وہ خود بھی ہم لوگوں کی بے سبب ہنسی سے حیران سا ہو گیا بہرحال بڑی مشکل سے ہم نے اس سے کہا ہاں! بھائی کھانا لے آؤ۔ اور وہ

کھانا لینے چلا گیا اس کے جانے کے بعد رئیس صاحب ضبط نہ کر سکے اور انھوں نے مولانا کو چارپائی پر ڈھکیل دیا اور جب مولانا چارپائی پر چت گرے تو کوئی کالی کالی چیز مولانا کے سفید پائجامے سے لٹکی ہوئی نظر آئی۔ وہ مولانا کا گم شدہ عینک کا خانہ تھا جو وضو کرتے وقت انھوں نے گود میں رکھ لیا تھا۔ اور وہ پائجامہ میں چپک گیا تھا۔

رئیس صاحب ریاض جیسے شاعر کے نواسے بھی تھے اور مزاج بھی ایک حد تک شاعرانہ تھا لیکن میرا خیال ہے کہ انھوں نے زندگی میں ایک شعر بھی نہیں کہا مگر شعر کا بڑا اچھا اور صاف ستھرا ذوق رکھتے ان کے پاس ایک مجلد ضخیم کاپی تھی جس میں وہ اپنی پسند کے اشعار اور نظمیں لکھ لیا کرتے تھے اس میں ان کے پسندیدہ قدیم و جدید شعراء کے کلام کا مختصر سا انتخاب بھی تھا اس کاپی کے سرورق پر غالباً شتی لکھا ہوا تھا جس کے معنی متفرقات کے ہوتے ہیں وہ یہ کاپی بہت عزیز رکھتے تھے اور بڑی مشکل سے کسی کو دیتے تھے۔ چھوٹے بھائی کی حیثیت سے میں اس پر اپنا حق سمجھتا تھا اور اس حق سے فائدہ اٹھانے میں کوئی کوتاہی بھی نہیں کی میں نے اسے پوری طرح پڑھا بھی اور اس میں سے اپنی پسند کا انتخاب بھی کیا ان میں یہ بڑی خوبی تھی کہ اپنے چھوٹوں پر اپنی پسند ذوق اور رائے عائد نہیں کرتے تھے بلکہ خود ان کے ذوق کے پروان چڑھنے میں ایک

مدد دیتے تھے۔

یوں تو ان کے مضامین اردو کے مختلف ماہناموں میں اسی وقت سے شائع ہونے لگے تھے جب وہ درجہ چہارم میں تھے لیکن جب انھوں نے نگار کے ایڈیٹر مولانا نیاز فتح پوری کے کسی مضمون کے خلاف لکھا تو اس کا کافی چرچا ہوا مولانا عبدالماجد صاحب نے بھی اسے پسند کیا اس طرح وہ یہاں کے ادبی اور علمی حلقوں میں متعارف ہو گئے اس کے بعد سے برابر لکھنے کا سلسلہ جاری رہا۔ وہ عربی اور انگریزی سے بڑی روانی سے ترجمہ کر لیتے تھے اور ان کی اسپیڈ حیرت انگیز تھی۔

جامعہ کی زندگی:۔

عربی تو ہم لوگ ندوہ سے پڑھ کر ہی جامعہ ملیہ گئے تھے لیکن انگریزی بھی ہم لوگوں کی ایسی ہو گئی تھی کہ اخبارات وغیرہ پڑھ اور سمجھ لیتے تھے جامعہ ملیہ جاتے وقت ہم لوگوں نے ندوہ کے اپنے استادوں سے سفارشی خطوط لے لیے تھے تاکہ ندوہ کے اپنے اخراج کی بنا پر وہاں داخلہ میں کوئی دقت نہ ہو ہم لوگوں کے جانے سے پہلے ہی ندوہ کے پڑھے ہوئے کافی لوگ وہاں جا چکے تھے منجملہ ان کے حفیظ الدین صاحب ندوی بھی تھے اس وقت غالباً مکتبہ جامعہ کا کوئی شعبہ ان کے سپرد تھا۔ ہم تینوں آدمیوں کو ندوے اور لکھنؤ دونوں کے چھٹنے کا بڑا غم تھا۔ مولانا عبدالسلام صاحب چوں کہ

ہم لوگوں کے میر کارواں تھے شاید اس لیے اپنے غم کو ظاہر نہ ہونے دیتے میں خاموش تھا لیکن رئیس صاحب آہیں بھر بھر کر اور اشعار پڑھ پڑھ کر اپنے دل کی بھڑاس نکال رہے تھے اور مولانا کے صبر پر چوٹ چوٹ کر ان پر سنگ دل اور بے حس ہونے کے الزامات لگائے جاتے تھے۔

ہم لوگ لمبا سفر طے کر کے جب قرول باغ پہونچے تو بارش کا پہلا چھینٹا پڑ چکا تھا مطلع صاف اور موسم خوشگوار تھا لیکن حفیظ الدین صاحب کا کمرہ اندر سے بند تھا اور اسٹوب جلنے کی آواز آرہی تھی دروازہ کھٹکھٹانے پر اندر سے حفیظ صاحب کے بجائے ایک عرب صاحب اس حال میں برآمد ہوئے کہ ان کے ایک ہاتھ میں بڑا چمچا تھا اور دوسرے ہاتھ سے وہ پیشانی کا پسینہ پونچھ رہے تھے۔ ہم لوگ اجنبی تھے لیکن انھوں نے عربوں کی روایتی مہمان نوازی کا ثبوت دیتے ہوئے " اہلاً وسہلاً" کہہ کر بڑی خندہ پیشانی سے ہمارا خیر مقدم کیا اور اپنی بول چال والی عربی زبان میں یہ بتایا کہ حفیظ الدین کہیں گئے ہیں لیکن جلد ہی آجائیں گے جسے ہم لوگ ذرا مشکل سے سمجھ سکے۔ تھوڑی دیر بعد حفیظ صاحب تو آئے نہیں لیکن عرب صاحب پارٹیشن کے باہر آئے اور انھوں نے کہا کھانا حاضر ہے تکلف کی کوئی گنجائش نہیں تھی کیوں کہ اب ہم لوگ کافی بھوکے ہو چکے تھے کھانے میں کباب، دال، روٹی

چاول، چٹنی کے علاوہ شوربہ دار گوشت بھی کافی مقدار میں تھا۔ ہم لوگوں نے تکلفاً دال سے شروع کیا لیکن عرب صاحب کو بڑے انہماک اور ذوق و شوق سے گوشت کھاتے دیکھ کر میرے اور رئیس صاحب کے شوق گوشت خوری کو ٹھیس سی لگی۔ مولانا عبدالسلام صاحب، مولانا ہونے کے باوجود نہ تو کھانے کے زیادہ شوقین ہیں اور نہ کپڑوں اور بستر کی طرف سے بے پرواکم کھاتے ہیں۔ سادہ صاف ستھرا لباس پہنتے ہیں اور سلیقہ سے رہتے ہیں چنانچہ ہمیں دونوں نے گوشت کی طرف بڑے شوق سے ہاتھ بڑھایا لیکن جب لقمہ منہ میں لے گئے تو گڑ بھرے ہنسیے کی طرح نہ نگلتے بن رہا تھا نہ اگلتے۔ اگلتے اس لیے نہیں تھے کہ میزبان کی دل شکنی ہوگی جس نے بڑی محنت سے گوشت پکایا بھی تھا اور بڑے ذوق و شوق سے مزے لے لے کر کھا بھی رہا تھا اور نگلتے اس لیے نہیں تھے کہ اس کے بعد اس سے زیادہ بد نما شکل برآمد ہونے کا پورا اندیشہ تھا ہم دونوں کی اس بے بسی سے پہلے تو مولانا نے لطف لیا لیکن آخر رحم آ ہی گیا اور مولانا نے عرب صاحب سے پانی کی فرمائش کی جو ان کے پیچھے رکھا تھا عرب صاحب نے جیسے ہی پانی کے لیے منھ پھیرا اور ہم نے قریب رکھے اگلدان میں لقمہ تھوک دیا اس کا کیا مزا تھا وہ بیان سے باہر ہے یوں سمجھ لیجئے کہ میٹھا سالن تھا جس میں شکر زیادہ اور نمک کم تھا

جس کی وجہ سے بوٹیاں بجائے نمکین کے میٹھی ہو گئی تھیں لیکن عرب صاحب بڑی مستعدی سے کھا رہے تھے جس سے ہم لوگ سمجھے کہ یہ عرب کا کوئی خاص کھانا ہوگا۔

جب حفیظ صاحب آئے تو ہم لوگوں نے صاحب سلامت اور ضروری بات چیت کے بعد اپنے انجان عرب میزبان کی میزبانی کی تعریف کی اور اس مخصوص ڈش کا خاص طور پر ذکر کیا جو انھوں نے مطبخ کے کھانے کے علاوہ خود تیار کی تھی۔ اس پر حفیظ صاحب نے اٹھ کر پتیلی میں بچا ہوا سالن چکھا اور خود بھی حیرت میں پڑ گئے۔ بعد کو انھوں نے عرب صاحب سے پوچھ کر بتایا کہ گوشت میں نمک زیادہ ہو گیا تھا اس لیے عرب صاحب نے اسے کم کرنے کے لیے بڑی فراخ دلی سے شکر جھونک دی تھی اور ان کے نزدیک اس سے مزہ دوبالا ہو گیا تھا۔

ہم لوگوں کا داخلہ اس اسپیشل کلاس میں ہو گیا جو عربی مدارس کے تعلیم یافتہ طلباء کے لیے کھولا گیا تھا جس کا ایک سال کا کورس تھا۔ اس کے بعد ایف اے میں داخلہ کر لیا جاتا تھا۔

اس اسپیشل کلاس کو ایک گھنٹہ شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب بھی پڑھاتے تھے اس زمانے میں قرول باغ، باغ کیا ایک جنگل کی صورت میں تھا اور جس عمارت میں جامعہ تھا وہ بالکل آبادی کے باہر چھوٹی سی

پہاڑی کے دامن میں واقع تھی جہاں کھلی ہوا کے ساتھ مچھر وں کی بھی افراط تھی جامع کے ماحول میں ہم لوگوں کو بالکل اجنبیت محسوس نہ ہوئی وہاں سادہ زندگی میں اعلا خیالات کی جھلک نظر آتی تھی اور وہاں کے اساتذہ مجیب صاحب، عابد صاحب، ذاکر صاحب، شفیق صاحب اور کیلاٹ صاحب وغیرہ کے ایثار اور ان کی سادہ زندگی سے کوئی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

تعلیم چھوٹے چھوٹے کمروں میں دری کے فرش پر ہوتی تھی مجیب صاحب پڑھانے کے دوران باتیں تو کیا نظریں اٹھا کر بھی نہ دیکھتے لیکن ذاکر صاحب پڑھانے کے درمیان مزے مزے کی باتیں بھی کرتے جاتے۔ ایک دن پڑھاتے پڑھاتے معلوم نہیں انھیں کیا خیال آیا کہ انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ آپ تاش کھیلنا جانتے ہیں کھیل کود سے مجھے دلچسپی ندوہ میں بھی اور جامعہ میں بھی رہی ہاکی کے اچھے کھلاڑیوں میں شمار کیا جانے لگا تھا اس لیے تاش کے کھیل سے ناواقفیت کے اظہار پر کچھ جھجک سی محسوس ہوئی لیکن واقعی نہیں جانتا تھا اس لیے کہنا ہی پڑا۔ اس کے بعد انھوں نے رئیس صاحب سے پوچھا تو انھوں نے شرما کر گردن جھکا لی یعنی بالجبر نہیں بالصبر اقرار کر لیا۔ کہ وہ بھی نہیں جانتے اس کے بعد دیوبند کے فارغ شدہ دو مولانا بیٹھے تھے۔ اب انکی باری آئی اور انھوں نے شرما کر اقرار کر لیا کہ وہ تاش کھیلنا جانتے تھے۔ اس پر ذاکر صاحب بھی

مسکرائے اور انھوں نے کہا بعض وقت انسان کا اندازہ بالکل غلط ہوتا ہے میں سمجھتا تھا کہ یہ دونوں داڑھی منڈے تاش کھیلنا ضرور جانتے ہوں گے۔

کلاس کے بعد رئیس صاحب نے مولانا عبدالسلام صاحب کی خوب خبر لی اور بگلا بھگت چھپے رستم اور معلوم نہیں کیا کیا بنا ڈالا۔ مولانا بچارے کیا بولتے۔ خاموش رہے۔ ان کی اس بے بسی پر رئیس صاحب کو رحم آگیا اور انھوں نے بڑی محبت سے گلے لگا لیا۔

جامعہ آئے ابھی دو سال بھی نہیں ہوئے تھے کہ مجھ پر پے در پے کئی بار ملیریا کا حملہ ہوا اور میں گھر چلا آیا۔ اس کے بعد میں جامعہ واپس نہ جا سکا اور ہائی اسکول میں داخلہ کرا کے باقاعدہ انگریزی کی تعلیم شروع کر دی اس کے بعد جب تک رئیس صاحب اور عبدالسلام صاحب جامعہ میں رہے برابر خط و کتابت رہی۔ وہ جب چھٹیوں میں آتے تو کوشش کرتے کہ زیادہ دن لکھنؤ ہی میں رہیں۔ آنے کے بعد ان کا ندوہ جانا لازمی تھا۔ جب ندوہ جاتے تو اپنے کمرے کے سامنے تھوڑی دیر تک کھڑے ہو کر پرانی یادیں تازہ کر لیتے۔ ان کی وضعداری اور محبت کا یہ عالم تھا کہ ڈالی گنج میں ان کے قصبہ کا کوئی یکہ والا رہتا تھا۔ جب وہ ندوے میں تھے تو وہ کبھی کبھار اس سے ملنے چلا آیا کرتا تھا۔

ایک مرتبہ رئیس صاحب لکھنؤ آئے اور ہم لوگ ندوہ گئے۔

وہاں تھوڑی دیر ٹھہرے کے بعد وہ یہ کہہ کر کہ میں ابھی آتا ہوں چلے گئے اور کافی دیر میں لوٹے بعد کو معلوم ہوا کہ وہ ڈالی گنج میں اپنے قصبہ کے یکے والے سے ملنے گئے تھے۔

جامعہ سے عبدالسلام صاحب اور رئیس صاحب خلافت اخبار بمبئی میں چلے گئے وہاں سے بھی خط وکتابت ہوتی رہی لیکن رفتار سست ہوتی جا رہی تھی بمبئی کی آب وہوا لکھنؤ اور دہلی کی آب و ہوا سے کافی مختلف تھی وہاں ان کی مشغولیتیں بھی بڑھ گئیں تھیں اور تعلقات بھی جب تک عبدالسلام صاحب بمبئی میں رہے تھوڑا بہت تعلق قائم رہا لیکن عبدالسلام صاحب کے وہاں سے چلے آنے کے بعد یوں ہی گاہے گاہے رئیس صاحب کا خط آ جاتا۔

لیکن آزادی کے بعد تقسیم کے نتیجے میں وہ پاکستان چلے گئے اس کے بعد حالات بھی بدل گئے اور عرصہ بھی کافی گزر گیا۔ ہم سب زندگی کے جنجال میں ایسے پھنس گئے کہ غم روزگار کے علاوہ یاد یاراں کی گنجائش ہی نہیں رہی۔ اس درمیان وہ پاکستان سے ایک مرتبہ لکھنؤ آئے کافی بدل چکے تھے قلبی شکایت پیدا ہو چکی تھی ڈاکٹر دل نے چلنے پھرنے سب پر پابندیاں عائد کر دی تھیں لیکن اس کے باوجود وہ ہمارے گھر کے اونچے زینے کی کٹھن منزل طے کر کے ملنے آئے

ہم کیا جانتے تھے کہ یہ آخری ملاقات ہے اس لیے آئندہ ملنے کی امید پر انھیں رخصت کر آئے اور پھر بدستور بے خبر ہو گئے۔ اور ایسے بے خبر ہوئے کہ ان کی موت کی خبر بھی ہمیں اس وقت ملی جب ان کا کفن میلا ہو چکا ہوگا۔

احتشام صاحب

دن کے ساڑھے گیارہ یا پونے بارہ بجے ہوں گے۔ ڈالی گنج سے واپسی پر بس بالکل دانش محل کے سامنے آ کر رک جانے کا ارادہ نہ تھا لیکن معلوم نہیں کیوں قدم اسی طرف بڑھ گئے خلاف معمول اس وقت وہاں بالکل سناٹا تھا۔ حتیٰ کہ بھائی نسیم (مالک دانش محل) کے لبوں پر وہ مسکراہٹ بھی نہ تھی جو بہت کم جدا ہوتی ہے مگر مجھے اس غمناک فضا کا کوئی احساس نہ تھا میں نے حسب معمول صاحب سلامت کے بعد بے تکلفی سے باتیں شروع کر دیں لیکن نسیم کی خاموشی نے مجھے چونکا دیا میں سبب پوچھنے ہی والا تھا کہ انھوں نے کہا آپ کو نہیں معلوم احتشام صاحب کا انتقال ہو گیا یہ سن کر بے اختیار میرے منہ سے نکلا کون احتشام صاحب انھوں نے گلو گیر آواز میں کہا ہمارے احتشام صاحب اور کون؟

اس کے بعد تھوڑی دیر تک میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یقین کروں

یا نہ کر دوں ابھی جب اردو اکیڈمی کے جلسے میں شرکت کے لیے احتشام صاحب یہاں آئے تھے تو بالکل چاق چوبند اور تندرست تھے ان کا سنجیدہ اور مسکراتا ہوا چہرا ایکدم نظروں کے سامنے آ گیا اور دل بیٹھنے لگا۔

۱۹۳۸ء میں جب لکھنؤ یونیورسٹی میں احتشام صاحب کا تقرر ہوا تو وہ اپنے شاگردوں میں بہتوں کے ہمعمر لگتے تھے چھریرے بدن پر شیروانی اور پائجامہ پہنے ہوئے وہ استاد کم طالب علم زیادہ معلوم ہوتے تھے لیکن اپنی ذہانت، قابلیت اور وسعت مطالعہ سے انھوں نے بہت جلد لکھنؤ کے ادبی حلقوں میں نمایاں جگہ حاصل کر لی میں نے بی اے میں اردو نہیں لی تھی اس لیے مجھے ان سے زیادہ قریب ہونے کا کبھی موقعہ نہ ملا۔

۱۹۴۰ء میں جب دانش محل وجود میں آیا تو تھوڑے ہی دنوں میں وہ لکھنؤ کے دانشوروں کا اڈا سا بن گیا۔ احتشام صاحب کی نسیم سے جان پہچان ان کے لکھنؤ میں آنے کے چند ہی دنوں بعد مکتبہ جامعہ (لکھنؤ) میں ہو گئی تھی جہاں اس زمانہ میں نسیم کام کرتے تھے اس لیے دانش محل کے کھلتے ہی احتشام صاحب وہاں آنے جانے لگے احتشام صاحب جلد بے تکلف ہونے والے لوگوں میں نہیں تھے لیکن نسیم کی خاموشی پر خلوص طبیعت نے رفتہ رفتہ دونوں کو بہت قریب کر دیا۔

جب تک احتشام صاحب لکھنؤ میں رہے ان کا یہ معمول رہا کہ وہ ہمیشہ دانش محل ہوتے ہوئے یونیورسٹی جاتے اور شام کو تو تقریباً روزانہ ان کی نشست یہاں رہتی ان کی وجہ سے شعروادب سے تعلق رکھنے والے اور لوگ بھی اکٹھا ہو جاتے اور رات کے آٹھ بجے تک بڑی پر لطف صحبت رہتی۔

کچھ دنوں بعد احتشام ہی صاحب کی ایما سے حلقہ احباب دانش کا قیام عمل میں آیا جس کے جلسے ہفتے ہفتے ہوتے جس میں ترقی پسند اور قدامت پسند بھی شریک ہوتے احتشام صاحب ترقی پسندوں کے سالار قافلہ ہونے کے باوجود بزرگ ادیبوں کا بڑا احترام کرتے تھے چنانچہ حلقہ احباب دانش کے جلسوں میں شریک ہونے والوں میں یگانہ صاحب اور اثر صاحب بھی تھے احتشام ان کا کلام بڑی دلچسپی سے سنتے اور داد دیتے۔ ترقی پسندوں میں سجاد ظہیر رضیہ سجاد ظہیر مسیح الحسن رضوی اور دوسرے نئے لکھنے والے شریک ہوتے دونوں گروہوں میں خیالات کے اعتبار سے بعد المشرقین ہونے کے باوجود جلسوں میں کبھی بدمزگی پیدا نہ ہوئی۔ احتشام صاحب اثر صاحب کے تیکھے جملوں سے پورا لطف لیتے اور محظوظ ہوتے۔

یہ دلچسپ ادبی نشستیں برسہا برس تک احتشام صاحب کی سرپرستی

میں جاری رہیں ان نشستوں کے انتظام اور بندوبست میں بھائی باقر حسین کا بڑا ہاتھ تھا لیکن ملک کی تقسیم نے جہاں بہت سی محفلیں درہم برہم کر دیں وہاں اس نے حلقۂ احباب دانش کا شیرازہ بھی بکھیر دیا۔ بھائی باقر حسین پاکستان چلے گئے اور اس اتھل پتھل میں ان ادبی نشستوں کا سلسلہ بھی ٹوٹ گیا۔

احتشام صاحب کی جس بات سے میں سب سے زیادہ متاثر ہوا وہ ان کی سادگی اور بھولا پن تھا وہ مخاطب کو اپنی علمیت اور شخصیت سے مرعوب نہیں کرتے تھے بلکہ متاثر کرتے تھے۔ بات چیت میں وہ مخاطب کو کبھی یہ محسوس نہیں ہونے دیتے تھے کہ وہ اردو کے ایک بڑے ادیب اور چوٹی کے نقاد سے بات کر رہا ہے۔ وہ چھوٹے بڑے سب سے ایک ہی سطح پر ملتے۔

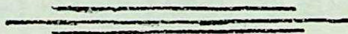
بارہا ایسا ہوا کہ وہ دانش محل آئے اور انھوں نے پوچھا نسیم صاحب کہاں ہیں معلوم ہوا کہ قریب ہی میں لکڑی کے اسٹال والے ایک چائے خانے میں چائے پینے گئے ہیں وہ بے تکلف وہیں چلے گئے اور وہیں بیٹھ کر چائے پی لی اور چلے آئے لکھنؤ سے الہ آباد چلے جانے کے بعد بھی ان کا تعلق دانش محل سے برابر قائم رہا۔ ایسا بہت کم ہوا کہ وہ لکھنؤ آئیں اور دانش محل نہ آئیں عام طور پر وہ اپنی آمد کی اطلاع خط کے ذریعہ پہلے ہی نسیم کو دیتے تھے

میں نے بارہا دیکھا کہ لوگ احتشام صاحب کا پروگرام معلوم کرنے دانش محل آتے تھے وہ الہ آباد سے جب لکھنؤ آتے تو ان کا پروگرام بہت مشغول ہوتا لیکن مشغولیت کے باوجود وہ عام طور پر سہ پہر کو چائے یہیں پیتے۔

دانش محل کے توسط سے مجھے بھی احتشام صاحب سے کچھ قریب ہونے کا موقع ملا۔ میرے ان کے کوئی بے تکلفی نہ تھی لیکن ان کے پر خلوص رویے نے قربت اور اعتماد کا احساس پیدا کر دیا تھا چنانچہ جب کبھی الہ آباد سے متعلق کوئی کام ہوا مجھے ان کو تکلیف دینے میں کبھی کوئی جھجھک محسوس نہیں ہوئی۔ حاجت مند اندھا ہوتا ہے چنانچہ بعض وقت انھیں ان کاموں کے متعلق بھی تکلیف دینی پڑی جو ان کے شایان شان نہ تھے لیکن انھوں نے کبھی مایوس نہیں کیا اور ہمیشہ جو ہو سکا کیا اور فوراً جواب دیا۔ میں نے اپنی پہلی کتاب داد کی بیداد کا مقدمہ لکھنے کو کہا انھوں نے بغیر کسی یاد دہانی کے اس پر مقدمہ لکھ کر الہ آباد سے بھیج دیا۔

احتشام صاحب میں نہ احساس برتری تھا نہ احساس کمتری مجھے ٹھیک سے یاد نہیں کہ بہار یا گورکھپور کے کسی ادبی جلسے میں شرکت کے لیے وہ اور کچھ دوسرے ادیب اور شاعر وہاں گئے تھے انھوں نے احتشام سے پوچھا کہ آپ جلسے کے بعد ہم لوگوں کو چھوڑ

کر چکے سے کہاں چلے گئے تھے انھوں نے کہا کبھی بات یہ تھی کہ جب میں وہاں بچپن میں اپنے والدین کی ملازمت کے دوران ایک چھوٹے سے مکان میں رہتا تھا اسے دیکھنے کا مجھے بے اختیار دل چاہا اس لیے میں تھوڑی دیر کے لیے اسے دیکھنے چلا گیا تھا یہی چھوٹی باتیں ہوتی ہیں جن سے آدمی کا چھوٹا یا بڑا پن ظاہر ہوتا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ چھوٹے سے گھر میں پرورش پانے والے احتشام صاحب بڑے آدمی تھے۔ ایسے بڑے آدمی جس نے کبھی اپنے کو بڑا محسوس ہونے نہیں دیا۔



مولانا سید نورالحسن

مولانا سید نورالحسن صاحب سے جن کا انتقال ابھی حال ہی میں ہوا ہے میری ملاقات ندوہ میں ہوئی مجھے ٹھیک سے یاد نہیں لیکن غالباً ۱۹۴۰ء تھا میں اس وقت لکھنؤ یونیورسٹی میں پڑھ رہا تھا۔ اور مولانا حیدر حسن صاحب مہتمم دارالعلوم کی خاص عنایت کی بنا پر مجھے میرے دوست اور ساتھی مولانا عبدالسلام قدوائی اور نجم الدین قدوائی کے ساتھ رہنے کی اجازت دے دی گئی تھی جو اس وقت ندوہ میں ملازم تھے اور پورٹیکو کے اوپر بنے کمرے میں رہتے تھے مولانا نورالحسن صاحب عبدالسلام قدوائی کے ہم زلف اور مدرس کی حیثیت سے ندوہ میں حال ہی میں ملازم ہوئے تھے تعارف کے بعد معلوم ہوا کہ وہ دیوبند کے فارغ التحصیل ہیں آپ سے کیا چوری مجھے خیال آیا کہ مولوی ہوں گے نہ وہ جلد بے تکلف ہونے کے عادی تھے نہ میں اس لیے کچھ دنوں دور ہی دور سے صاحب

سلامت رہی لیکن ان کی نورانی داڑھی کے ساتھ ان کا چہرہ بھی نورانی تھا گورا رنگ بڑی بڑی ڈورے دار آنکھیں چوڑی پیشانی ستواں ناک شاداب چہرہ اور لبوں پر ہر وقت کھلتی ہوئی مسکراہٹ یہ کہتی تھی کہ گھبرایئے نہیں میں زاہد خشک نہیں رند پاکباز ہوں جس کے کے متعلق شاعر نے کہا ہے ؎

دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

دھیرے دھیرے اجنبیت ختم ہوتی گئی ہم ایک دوسرے کے قریب ہوتے گئے اور اتنے قریب ہو گئے کہ مجھے اس دیوبندی مولوی کی داڑھی کے نیچے سینے میں چھپے دردمند دل کی دھڑکنیں محسوس ہونے لگیں مولانا عبدالسلام قدوائی ہمیشہ اپنے کو لئے دیئے رہتے تھے اور ہم لوگوں سے ذرا بزرگانہ شان سے ملتے تھے مگر میں نجم الدین قدوائی اور مولانا نورالحسن رفتہ رفتہ کافی گھل مل گئے۔ نجم الدین قدوائی تو شاعر ہیں حالانکہ انھوں نے صاحب دیوان ہونے کی فکر نہیں کی۔ لیکن وہ بہت سے صاحب دیوان شاعروں سے اچھا کہہ لیتے ہیں میں نہ شاعر ہوں اور نہ شعر موزوں پڑھ پاتا ہوں لیکن آپ کی دعا سے شعر سمجھ لیتا ہوں اور اچھے اشعار سن کر خوشی محسوس کرتا ہوں مولانا نورالحسن شاعر تو نہ تھے مگر دل شاعرانہ پایا تھا انھیں سیکڑوں

اشعار یاد تھے گرمی کے موسم میں جب چاندنی چھٹکی ہوتی تھی تو ہم لوگ
ندوہ کے سامنے گومتی کے کنارے بیٹھ کر ان سے اشعار سنتے تھے وہ جو
اشعار سناتے تھے ان سے ان کے ذوق سلیم کا اندازہ ہوتا تھا۔ انھیں
میر کا کلام بہت پسند تھا اور وہ ان کے اشعار اس درد بھرے انداز
میں پڑھتے تھے کہ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ مولانا کا دل چوٹ کھایا ہوا
ہے مگر باوجود بے تکلفی کے یہ پتہ نہ چل سکا کہ میری بدگمانی تھی یا
واقعی ان کے دل نے کہیں چوٹ کھائی تھی مولانا بہت قایل اور روزہ نماز کے بڑے
پابند تھے لیکن انھوں نے علم اور اپنے زہد کا رعب ڈالنے کی کبھی کوشش نہیں
کی ۱۹۴۲ء میں جنگ آزادی کا زور ہوا مولانا لیڈر نہ تھے نہ لیڈرانہ مزاج تھا
مگر آزادی کے دل دادہ تھے اور جب آزادی کی لڑائی میں توڑ پھوڑ شروع
ہوئی تو ہم لوگوں نے بھی اپنی بساط بھر اس میں حصہ لیا اور آرٹ اسکول
کے سامنے سڑک پر لگے بجلی کے تار کاٹ دیئے

مولانا کی شادی ھگور کے پاس بھٹولی گاؤں کے زمیندار سید محفوظ احمد صاحب
کی بڑی لڑکی سے ہوئی تھی۔ مولانا سلطان ولا ڈالی گنج میں اپنی
اہلیہ کے ساتھ رہتے تھے انھوں نے ہمیں بھی اپنے ساتھ رکھ لیا تھا تاکہ
ہمیں کھانے پینے کی کوئی تکلیف نہ ہو بھائی مشتاق احمد عرف تمن مولانا کی بیوی کے بھائی بھی
اور ان کے ساتھ رہتے تھے وہ بھی بڑی محبت والے آدمی ہیں۔ وہ اپنی بہنا

کو بجیا کہتے تھے۔ اس لیے میں بھی ان کو بجیا کہنے لگا اور اس نیک خاتون نے مجھے کبھی یہ محسوس نہ ہونے دیا کہ وہ میری حقیقی بہن نہیں ہیں۔ اتفاق دیکھئے کہ ان کا انتقال بھی پتے کے آپریشن کے بعد میڈیکل کالج میں ہوا۔ میں اور میری اہلیہ ان کو دیکھنے گئیں عصر کا وقت تھا ان کی حالت بہت خراب تھی ہم دونوں ان کے قریب خاموش بیٹھے تھے کہ انھوں نے ہمارے سامنے ہی آخری سانس لی مولانا نورالحسن صاحب کا انتقال بھی پتے کے آپریشن کے بعد ہوا مگر یہ میری بدقسمتی تھی کہ آخر وقت میں ان کے پاس نہیں تھا کیونکہ میری اہلیہ سول اسپتال میں داخل تھیں اور میں ان کی دیکھ بھال میں لگا تھا۔

مولانا نورالحسن صاحب کے باپ دادا بھٹولی ہی کے رہنے والے تھے لیکن ان کا خاندان ملازمت کے سلسلے میں حیدرآباد چلا گیا تھا اور مولانا کی زندگی کا اکثر حصہ وہیں گذرا۔ گھریلو تعلیم کے بعد وہ دیوبند چلے گئے اور وہیں تعلیم مکمل کی۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ مولانا کی دونوں لڑکیوں اور مسلمہ بجمہ کی شادیاں ان کے سامنے ہی ہو گئیں اور ان کے دونوں صاحبزادے برسرروزگار ہیں۔ مولانا کی عمر ستر سال سے اوپر ہی ہوگی لیکن وہ مجھے کبھی بیمار نظر نہ آئے شاید اس لیے کہ انھیں کبھی رونا رونے کی عادت نہیں رہی وہ جب ملتے مسکرا کر بات کرتے ان کی معصوم مسکراہٹ اس وقت بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے مگر اب وہ خوش کرنے کے بجائے دل میں ایک کسک پیدا کر رہی ہے مگر اب زیادہ دن نہیں ہم بھی جلد ہی ان سے جا کر مل جائیں گے ۔

آج وہ کل ہماری باری ہے

سید ناصر علی

تقریباً نصف صدی سے جو آواز لکھنؤ کے گلی کوچوں میں بلا ناغہ برابر گونجتی رہی ہو وہ اگر کسی دن نہ سنائی دے تو شہر کی چہل پہل کے باوجود سناٹا سا محسوس کرنا قدرتی بات تھی۔ مارچ کی ایک سونی صبح اسی قسم کا سناٹا مجھے اس وقت محسوس ہوا جب دن چڑھ جانے کے باوجود اپنی گلی میں سید ناصر علی ایجنٹ اخبارات کی کڑاکے دار جانی پہچانی آواز سنائی نہ دی۔ خیال ہوا کہ شاید کہیں چلے گئے ہوں دوسرے دن بھی ان کی آواز گلی میں نہ گونجی تب مجھے فکر ہوئی اس لیے کہ جس طرح اخبار کا دفتر ایک دن سے زیادہ بند نہ ہوتا اور وہ مولوی اسمٰعیل میرٹھی کی دھن کی پوری اور کام کی پکی پن چکی کی طرح صبح سویرے سے رات گئے تک برابر چلتی رہتی۔

سید ناصر علی جس طرح اپنی رقم وصول کرنے میں سخت تھے اسی طرح اپنی ڈیوٹی کے بھی سخت پابند تھے اس لیے ایک دن سے زائد

ناغہ غیر معمولی بات تھی۔ شام کو جب میں دانش محل گیا تو میں نے دانش محل کے مالک بھائی نسیم سے صاحب سلامت کے بعد ان کی خیریت نہیں بلکہ ان کے کرم فرما سید ناصر علی کی خیریت دریافت کی کیونکہ عملاً دانش محل ہی میر صاحب کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ وہیں بیٹھ کر وہ اپنے ہاکروں کو کام تقسیم کرتے وہیں ان سے حساب لیتے اور ضرورت پڑتی تو وہیں ڈانٹ پھٹکار کرتے اور یہ ضرورت اکثر پیش آتی کیوں کہ بوڑھے ایجنٹ کے معیار کے مطابق کوئی جوان ہاکر کام نہ کر پاتا۔

نسیم صاحب نے پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے بتایا کہ سید ناصر علی بیمار بھی ہیں۔ اور انھیں چوٹ بھی آگئی میں نے پوچھا چوٹ کیسے آئی ؟ تو انھوں نے بتایا کہ انھیں سوئے ہضم کی شکایت تھی۔ غذا نہیں ہوئی تھی لیکن غذا کی فراہمی کی فکر نے بیٹھنے نہ دیا۔ سائیکل پر سوار ہو کر چلے تو کہیں لڑکھڑا کر گر پڑے۔ انھیں چوٹ زیادہ نہیں آئی تھی لیکن جب سے بستر سے لگے پھر اٹھ نہ سکے۔ صحت پہلے سے خراب تھی۔ بیماری نے طول کھینچا دوا کم دعا زیادہ ہوئی میر صاحب خود بھی نذر نیاز اور دعا، تعویذ کے قائل تھے گھر والے ان سے زیادہ۔ بیماری بڑھتی گئی آمدنی گھٹتی گئی۔ روزی کی فکر اور بیماری کے بادنے اس شخص کو چارپائی سے اٹھنے

نہ دیا جس نے زندگی کی اکثر گھڑیاں چارپائی کے بجائے سائیکل کی گدی پر گزاری تھیں میر ناصر علی دن میں تو کیا رات کو بھی مشکل سے چار پانچ گھنٹے چارپائی پر بسر کرتے باقی رات ریاضت میں گزار دیتے تھے جھریوں دار پیشانی پر سجدے کا نشان ان کی دن کی مشقت اور رات میں ریاضت کا ثبوت تھا۔ مشقت کا پھل ملا ہو یا نہ ملا ہو لیکن ریاضت کا ثمرہ تو ضرور ملا۔ اور میر ناصر علی رمضان کے مبارک مہینے کی پہلی کو اللہ کے پیارے ہو گئے۔ وہ نہیں رہے لیکن ان کی آواز ابھی عرصہ تک اخبار پڑھنے والوں کے کانوں میں گونجتی رہے گی اور ان کی نظریں انھیں ڈھونڈھتی رہیں گی

میر ناصر علی ضلع بارہ بنکی کے قصبہ سدھور میں سنہ ۱۸۹۹ء کے لگ بھگ سیدوں کے ایک شیعہ گھرانے میں پیدا ہوئے ایک مرتبہ ایسا ہوا تھا کہ قصبہ میں طاعون آیا اور محلے کے محلے صاف کر گیا جس کی لپیٹ میں ناصر علی کا گھرانا بھی آیا اور سوائے سخت جان ناصر علی کے پورا گھر صاف ہو گیا۔ گھر میں تھا ہی کیا جس کے سہارے وہ وہاں ٹکتے اس لیے میر ناصر علی سامان کے بوجھ سے سبکدوش وطن کی یادوں کا بوجھ دل میں لیے پاؤں پیدل اپنی نگری چھوڑ کر شاہ جانِ عالم کے نگر لکھنؤ چلے آئے۔

پردیس میں بے سہارا نوجوان کو کون جگہ دیتا لوگ چور، اچکا سمجھ

کر مشتبہ نظروں سے دیکھتے دن کو شہر کی گلیوں کی خاک چھانتے اور رات کو کسی دکان کے تختے پر پڑ رہتے اور بیتے دنوں اور بچھڑے دیس کی یاد خوابوں میں تازہ کرتے دو ایک دن تو اسی طرح جوں توں کاٹ دیئے لیکن زندگی کی ملبی راہ یوں کیسے کٹتی روزی کی تلاش میں دکانوں پر گئے دروازوں پر دستک دی لیکن دکان کے تختے پر لیٹنے والے کو دکان پہ جگہ نہ ملی۔

ہاں اک دروازے پہ دستک کا جواب ڈیوڑھی سے نہیں کوٹھے سے ملا بھوکے پیٹ نے دماغ کو نشیب و فراز پر غور کا موقعہ ہی نہ دیا اور بازار سے بستر اٹھا کر میر ناصر علی بام پر پہنچ گئے معلوم نہیں کہ کتنے دنوں تک کوٹھے پر آنے والوں کی خدمت انھیں پیٹ پالنے اور دوسری جگہ تلاش کرنے کے لیے کرنی پڑی۔

بہر حال حسن و نغمہ کی اس فضا کا کچھ نہ کچھ اثر ناصر علی کے نوجوان دل پر پڑا جس نے بعد میں انھیں غم روزگار کے ساتھ غم عشق میں کبھی مبتلا کر دیا بے سہارا، پردیسی نوجوان کے لیے غم روزگار ہی کیا کم تھا غم عشق نے دل کے ساتھ دماغ پر کبھی اثر کیا اور کچھ دنوں تک ناصر علی لکھنؤ کے گلی کوچوں کا گشت اس طرح کرتے رہے جیسے وہ بے خبری کے عالم میں اخبار بیچنے کی مشق کر رہے ہوں جو حالات تھے اس میں غم عشق زیادہ دنوں تک ٹک نہ سکتا تھا غم روزگار رفتہ رفتہ اتنا بڑھ گیا کہ غم عشق بھول گیا

یعنی دوڑ بڑھ کر دوا بن گیا اور دماغ صحیح ہو گیا۔

لیکن اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے کہ مصداق ابھی دامِ عشق سے اچھی طرح آزاد بھی نہ ہوئے تھے کہ اہلی زندگی کی بیڑیاں پاؤں میں پڑ گئیں جن کی گرفت دن دن بھر دوڑتے رہنے کے باوجود بھی ڈھیلی نہ ہوئی قسمت تو دیکھئے کہ گردش کے مارے میر ناصر علی کو بیوی بھی ملی تو گلیوں کا گشت لگانے والے ایک اخبار فروش کی بیٹی خسر سید جالب کے اخبار "ہمدم" کے پرانے ایجنٹ تھے اور کافی رسوخ رکھتے تھے چنانچہ انھوں نے اپنے ساتھ گردش روزگار کے ستائے داماد کو بھی اسی کام میں لگا دیا۔ میر ناصر علی کو گلیوں کے گشت کی پہلے ہی سے اچھی خاصی مشق ہو چکی تھی اس لیے انھیں اس کام میں کوئی خاص زحمت نہ ہوئی پہلے گلی کوچوں کا چکر بلا وجہ بے غرضی میں کرتے تھے۔ اب پیسے کمانے اور اخبار بیچنے کے لیے کرنے لگے۔ اخبار لکھنے کے لیے (اخبار نویسی) اور اخبار پڑھنے کی طرح شاید اخبار بیچنے کی بھی لت ہو جاتی ہے چنانچہ بیچارے میر ناصر علی آخر وقت تک اسی لت میں مبتلا رہے اور ہمدم سے لے کر قومی آواز تک اخباری خاندان کے چھوٹے بڑے اور اچھے برے تمام بچوں کو بڑے پیار سے گود میں بیٹھا کر سائیکل پر لکھنؤ کی سیر کراتے اور پروان چڑھاتے رہے۔

عاشق ناکام کی طرح وہ کسی ایک جگہ نہ ٹکتے ابھی سنٹرل ہوٹل کی

سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے تازہ اخبار کی صدا دیتے نظر آتے ۔ تو تھوڑی ہی دیر میں انورؔ تی اسٹال کے سامنے ان کی سائیکل کھڑی ہوتی پھر آن کی آن میں امین آباد میں وہ عبداللہ کی دکان کے سامنے رواں دواں دکھائی دیتے ان کی طرح سائیکل بھی ساٹھی یا کٹھی تھی بوڑھی اور شکستہ ہونے کے باوجود اپنے مالک کی طرح اس نے بھی زندگی کی دوڑ میں شکست قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا ۔ اور دم لیے بغیر دن بھر چلتی رہتی ۔

سید ناصر علی نماز فجر سے فراغت کے بعد تسبیح کے بجائے سائیکل ہاتھ میں لے کر منھ اندھیرے گھر سے نکل پڑتے اور پھر ان کی سائیکل سے

ایک چکر ہے میرے پاؤں میں زنجیر نہیں

کا مصرعہ گنگناتی ہوئی دن بھر شہر کے گلی کوچوں کا چکر کاٹا کرتی میر ناصر علی چلتے پھرتے کبھی کسی ہوٹل میں اور کبھی کسی کرم فرما کے یہاں چائے پانی کر لیتے ۔ ورنہ وہ کنبے کا پیٹ پالنے کی فکر میں اپنا کھانا پینا بھولے رہتے ۔ آہستہ آہستہ دن چڑھ جاتا اور گاہکوں کی تعداد کم ہو جاتی تب انھیں کھانے کا خیال آتا اور وہ بارہ بجتے بجتے دانش محل پہونچ جاتے جہاں رومال میں بندھا ان کا کھانا گھر کا کوئی لڑکا پہلے ہی سے رکھ جاتا اس میں کیا ہوتا ہمیں نہیں معلوم لیکن جب وہ پچھلے کمرے سے کھانا کھا کر نکلتے تو ان کے چہرے پر تازگی کے بجائے جھریاں اور نمایاں نظر آتیں اور جب

شکر ادا کرتے تو وہ ایک گہرا طنز معلوم ہوتا۔

قدرت نے شاید اخبار لکھنے والوں کی طرح اخبار بیچنے والوں کی قسمت کا ستارہ کبھی گردش میں رکھنا ہی مناسب خیال کیا ہے اور جس طرح دن دن بھر قلم گھسنے کے باوجود اخبار نویسوں کو اپنے بال بچوں کا پیٹ پالنا مشکل ہوتا ہے اسی طرح صبح سے شام تک سائیکل چلانے اور صدا لگانے کے باوجود اخبار بیچنے والوں کے لیے پیٹ بھر کھانا ملنا دشوار ہوتا ہے۔ یہ بات چاہے اور کسی کے لیے نہ صحیح ہو لیکن میر ناصر علی کے لیے سولہ آنے صحیح تھی۔ اس میں شک نہیں کہ اس سلسلہ میں شائد خوبی تقدیر کے علاوہ کچھ خود ان کی طبیعت کو بھی دخل تھا۔

قدرت کو ان کی قسمت کا حال معلوم تھا اس لیے اس نے ان پر بال بچوں کا بار نہیں ڈالا اور تنہا میاں بیوی کی دال روٹی کے لیے ان کی آمدنی کچھ کم نہ تھی۔ ایک موٹے اندازے کے مطابق وہ مہینے میں ڈھائی تین سو کما لیتے تھے۔ وہ بذات خود کافی کفایت شعار تھے وہ اپنے ہاکر کافی ٹھوک بجا کر رکھتے کم سے کم تنخواہ کا آدمی ڈھونڈھتے اور خوب کس کر کام لیتے اس لیے خیال ہے کہ ہاکروں کی تنخواہ نکالنے کے بعد دو سوا دو سو ماہوار بچ جاتے شروع میں شاید خرچ کم تھا اسی لیے رسی بٹان میں ان کی اپنی گاڑھی کمائی سے ان کا اپنا ایک پختہ مکان ہو گیا تھا۔

لیکن ادھر گزشتہ دس پندرہ برسوں میں ایک طرف چیزوں کی قیمتیں بڑھ کر آسمان پر پہونچ گئیں دوسری طرف ان کی کنبہ پرور طبیعت نے بے بال بچے والے گھر کو بال بچوں سے اس طرح بھر دیا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی اور وہ ان کی پرورش اور دیکھ بھال میں دن رات ایسے لگے رہتے تھے کہ انھیں اپنے تن بدن کا ہوش نہ رہتا اور وہ صاحب اولاد نہ ہونے کے باوجود زندگی بھر اولاد کے بار سے اپنے کاندھے سیدھے نہ کر سکے۔

عمر ۶۵، ۶۶ سال سے زیادہ نہ تھی لیکن زندگی کا تکان ان کے پورے جسم میں نمایاں تھا پیشانی اور چہرے کی جھریوں کے درمیان منجھولی مٹیالی آنکھیں فریاد کرتی معلوم ہوتیں، گندمی رنگ مٹی میں مل کر ان کی خاکی نیکر سے میچ کرنے لگا تھا وہ گرمیوں میں عام طور پر خاکی نیکر اور قمیص پہنتے ان کی لمبی ٹانگوں کی پتلی پنڈلیوں پر موٹی موٹی نسوں کا جال سا نظر آتا شاید دن دن بھر سائیکل چلانے سے نسیں بے چین ہو کر باہر نکل آئی تھیں اور ایک دوسرے سے دست و گریباں تھیں ضعیفی اور صحت کی خرابی کے باوجود میر ناصر علی نے ہار نہ مانی تھی اور زندگی کی دوڑ میں دم لیے بغیر آخر دم تک سرگرمی سے حصہ لیتے رہے دوپہر کو جب وہ دانش محل میں لنچ کے لیے آتے اور اخبارات اور رسائل کا بنڈل دونوں

صوفیوں کے درمیان رکھی اسٹول پر رکھ دیتے تو ہمارے ایک دلچسپ دوست انھیں محض چھیڑنے کے لیے ان سے کہتے کہ اگر اجازت ہو تو ایک نظر شمع پر ڈال لوں اس کے جواب میں وہ ہمیشہ اپنا یہ مخصوص جملہ "جب کبھی مطلب کی کہی" اپنے خاص انداز میں دہراتے اور ہم سب لطف اندوز ہوتے۔

ایک مرتبہ اتوار کا دن تھا دانش محل میں دانشوروں کا جمگھٹا تھا۔ میر صاحب کبھی تازہ اخبارات اور دیدہ زیب رسائل کا پلندہ دبائے آ گئے اور میز پر رکھ کر اندر والے کمرے میں کھانا کھانے چلے گئے یاروں کو موقعہ مل گیا کسی نے بیسویں صدی اٹھا لیا اور کوئی شمع پر پروانے کی طرح ٹوٹ پڑا! میر صاحب کھانے سے فراغت کے بعد لوٹے تو دیکھا ان کا سرمایہ حیات لٹ تا جا چکا تھا۔ تھوڑی دیر تو صبر اور جبر کیے کھڑے رہے لیکن جب ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں خوبصورت ٹائٹل پیج والے رسالوں کو جاتے دیکھا تو شمع پر بنی ایک ایکٹرس کی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بے بسی سے بولے۔

"چٹکی چٹکی میں گوری کا رنگ مٹا جائے"

اس پر ایک قہقہہ بلند ہوا جس میں خود میر صاحب شریک تھے لیکن دل سے نہیں۔ میر صاحب اخبارات اور رسائل کے معاملہ میں مروت مشکل سے کرتے تھے

اپنی رقم کی وصولی کبھی بڑی سختی سے کرتے شاید ان کے تنگ حالات میں مروت کی گنجائش نہ تھی۔ اگر ان کا کوئی گاہک دام دینے کے سلسلہ میں ایک دو مرتبہ دوڑاتا تو وہ دل کی بھڑاس اکثر دانش محل میں دل کھول کر نکالتے اور اپنی لکھنوی زبان میں خوب ہی خوب سناتے اور چلتے وقت نادہند گاہکوں کا بدلہ دانش محل کے دہند مالک سے نکالتے اور اور ان سے اخبار کے دام پیشگی در پیشگی مانگتے تو نسیم صاحب میر صاحب کو محض چھیڑنے کے لیے کہتے اتنا کماتے ہیں کس کو دے آتے ہیں۔ میں اب آپ کو آپ کی بیگم سے پوچھے بغیر ایک پیسہ بھی پیشگی نہ دوں گا تب وہ اپنے گھر کا بجٹ تفصیل سے بتاتے جس میں سرکاری بجٹ کی طرح دفاع کی مد پہ سب سے زیادہ رقم صرف ہوتی یہ رقم کسی بیرونی حملہ سے بچنے کے لیے خرچ نہ کی جاتی بلکہ دوزخ کی آنچ سے بچنے اور عاقبت بنانے کے سلسلے میں نذر و نیاز پر خود بیوی کے ہاتھوں بلکہ ان کے اصرار سے صرف ہوتی۔ محرم میں تو پورے ماہ مجالس کا سلسلہ جاری رہتا۔

میر ناصر علی کو اپنے وطن سدھوڑ سے آئے ہوئے تقریباً نصف صدی گذر چکی تھی گھر کا شاید نام و نشان بھی باقی نہ رہا ہوگا مگر وطن کی یاد اب بھی ان کے دل میں تازہ تھی۔ بیمار پڑنے سے کچھ پہلے ایک دن مجھے قیصر باغ بس اسٹینڈ پر ایک بجے کے قریب ملے میں نے دیکھا کہ وہ

وہاں اخبار بیچنے کے بجائے بارہ بنکی کا ٹکٹ لینے آئے لائن میں لگے لوگوں کا منہ تک رہے ہیں۔ میں نے کہا میر صاحب کیا سدھور جانے کا ارادہ ہے اس پر وہ کچھ خاموش رہے اس کے بعد ٹھنڈی سانس لے کر بولے سدھور جانا نہیں ہے سدھور جانے والوں کی تلاش ہے بعد کو معلوم ہوا کہ جب میر صاحب ادھر سے نکلتے تو ایک نظر بارہ بنکی جانے والوں پر ضرور ڈال لیتے کہ شاید کسی ہم وطن کی جانی پہچانی صورت نظر آجائے تو وہ اپنے وطن کا حال معلوم کر لیں۔



اسماعیل باربر

نظیر آباد میں منڈی کے پاس برآمدے والی مزدور کی دکان میں پنکھا ہلکے ہلکے چل رہا تھا دوپہر کا وقت تھا سڑک خاموش تھی اور اونچی چھت والے بڑے سے کمرے میں سکون تھا۔ لیکن اسماعیل صاحب کی قینچی اور ساتھ ہی ساتھ زبان تیزی سے چل رہی تھی اسمٰعیل صاحب بال تو اچھے کاٹتے ہی تھے لیکن باتیں اس سے زیادہ اچھی کر لیتے تھے یہی وجہ تھی کہ ہم (اسحاق (ان کے چھوٹے بھائی) سے بال بنوانے کے بجائے اسمٰعیل صاحب سے بال بنوانے میں۔ بال کے ساتھ باتوں کا بھی لطف آتا تھا لیکن نوک پلک کا خیال رکھنے والے با ذوق لوگوں کا کہنا ہے کہ بڑے بھائی باتوں کے اور چھوٹا بھائی بالوں کا بادشاہ تھا۔ ہمیں بالوں کی تراش خراش کی زیادہ فکر نہیں تھی بس ٹھیک کٹنا چاہیئے تاکہ لوگ یہ نہ کہنے لگیں کہ کیا گما سیلون سے بال کٹا کر آ رہے ہیں چنانچہ ہم اس کی کوشش کرتے تھے کہ اسماعیل صاحب سے لطف گفتگو حاصل ہو سکے ہم نے

میں نے باتوں کا سلسلہ جاری رکھنے کے لیے ایک دن پوچھا کہ اسمٰعیل صاحب
آپ نے یہ دکان کب کھولی تھی ہمارا یہ سوال سنتے ہی ان کی زبان اور قینچی
دونوں ایک ساتھ رک گئیں اور وہ بال کاٹنے کے بجائے تھوڑا سا
ہٹ کر چوڑی اینٹوں والے فرش پر دیکھنے لگے اور کہنے لگے دیکھئے
اس اینٹ پر کون سا سن پڑا ہے بس اسی سن میں میں نے دکان کھولی ہے
اس اینٹ پر جہاں تک میرا خیال ہے ۱۹۲۵ء پڑا تھا۔

۱۵ جنوری ۱۹۷۷ء کو دوپہر کے وقت جب میں ادھر سے گزر رہا تھا تو ان
کے ایک جاننے والے نے مجھے یہ خبر بد سنائی کہ ۵ دسمبر ۱۹۷۶ء کو اسمٰعیل صاحب
کا انتقال ہوگیا یہ سنتے ہی میرے آنکھوں کے سامنے اچانک اس دوپہر کا
نقشہ آگیا جب وہ ٹیڑی پھرتی سے اینٹ پر سن دیکھنے کے لیے بڑھے تھے اس
وقت اسمٰعیل اور اسحاق باربر کا طوطی بولتا تھا شہر کے ہر حصہ سے سفید پوش
حضرات اسی دکان پر آکر بال بنواتے آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا
جن کے بیٹھنے کے لیے بیچ دار نقشی خوبصورت کرسیاں دیوار سے لگی رکھی رہتی
تھیں اور وقت گزاری کے لیے السٹریٹیڈ ویکلی کے پرچے میز پر رکھے رہتے
تھے تاکہ لوگ انھیں پڑھ کر انتظار کی گھڑیاں کاٹ سکیں اسمٰعیل صاحب
اسحاق اور دو نوکروں کی قینچیاں برابر چلتی رہتی تھیں لیکن اس کے باوجود
باری آنے کے لیے کافی انتظار کرنا پڑتا تھا۔ نوک پلک کا خیال رکھنے والے

لوگ جو صرف اسحاق یا اسمٰعیل ہی سے بال کٹوانا چاہتے تھے انھیں تو اور زیادہ انتظار کرنا پڑتا تھا خیر ہم تو ان لوگوں میں تھے جو اگر اسمٰعیل صاحب خالی نہ ہوتے اور ان کے یہاں کے دوسرے بال بنانے والے خالی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ٹرمیں جھجک سے کہتے کہ تشریف لائیے تو ہم انکار کر کے ان کی دلشکنی کی ہمت نہ کر پاتے اور ان کو بھی پیشانی پر شکن لائے بغیر جھیل لے جاتے اور جب وہ بال بنانے کے بعد آئینہ دکھاتے اور ہماری طرف داد طلب نظروں سے دیکھتے تب بھی ہم ان کو مایوس نہ کرتے اور آئینے میں دیکھے بغیر کہتے کہ بال بالکل ٹھیک کٹے ہیں۔

اس زمانے میں اسمٰعیل و اسحاق باربر کی ایسی دھاک بیٹھی ہوئی تھی کہ چاہے بال اچھے کٹے ہوں یا خراب نکتہ چینیوں کا منہ بند کرنے کے لیے یہ کہہ دینا کافی ہوتا تھا کہ بال اسمٰعیل کے یہاں بنوائے ہیں ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ ہم اپنے گھر دیہات گئے بال ہمارے اکثر بڑھے رہتے تھے ہم بال بنوانا ایک طرح سے بیگار سمجھتے تھے اور بالکل مجبور ہو کر بال بنواتے تھے ہمارے یہاں کے خلیفہ جی جب داڑھی بنانے آئے تو انھیں ہمارے بڑھے ہوئے بالوں پر ترس آگیا اور انھوں نے ہم سے مشورہ کیے بغیر داڑھی کے ساتھ بال بھی بنا دیئے بال جیسے بنے ہوں گے وہ ظاہر ہے جب ہم شہر آئے تو ساتھیوں نے ہمارے بال دیکھ کر مین میخ نکالنا شروع کر دیا لیکن

ہم نے بڑے اعتماد اور وثوق کے ساتھ زرا زور سے کہا کہ آپ لوگوں کو کچھ تمیز بھی ہے کہ یونہی نقص نکالنے بیٹھ گئے آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ میں اسمٰعیل کے یہاں سے بال بنوا کر آرہا ہوں اس کے بعد بالکل سناٹا ہوگیا اور کسی کو منہ کھولنے کی ہمت نہ پڑی۔

اسمٰعیل صاحب پر غالباً ۱۹۷۶ کے شروع یا ۱۹۷۵ء کے آخر میں دل کا دورہ پڑا تھا شہر کے پرانے بڑے ڈاکٹر ان کو بہت مانتے تھے ان کا بہت اچھی طرح علاج ہوا اور وہ ایسے بھلے چنگے ہوگئے کہ ہمارے گھر کا اونچا زینہ چڑھ کر بال بنانے چلے آتے چھوٹے بھائی اسحاق کے مرجانے کا انھیں بڑا صدمہ ہوا تھا۔ وہ کہا کرتے تھے۔ کہ میں نے اپنے بیٹے کی طرح پالا تھا۔ اسمٰعیل صاحب کے والد کا انتقال جس وقت ہوا اس وقت تینوں بھائیوں یعنی اسمٰعیل ابراہیم اور اسحاق میں سب سے بڑے اسمٰعیل صاحب ہی تھے والد کے انتقال کے وقت ان کی عمر ۱۴۔۱۵ سال کی ہوگی اسحاق کے انتقال اور زمانے کی رفتار بدل جانے سے وہ کافی بددل رہتے تھے دکان پر اس کا اثر پڑا تھا بال ترشوانے کے بجائے بال رکھانے کا فیشن مقبول ہورہا تھا۔ دوسرے وہ نئے فیشن کے ٹیڑھی بال بنانا پسند بھی نہیں کرتے تھے آخر میں جب ہم ان کی دکان پر جاتے جس میں اب نہ نوکر رہ گئے تھے اور نہ اسٹینڈ و لکی۔ تو وہ بڑی حسرت سے کہتے تھے اب تو صرف پرانے

وضع دار گاہک ہی ہمارے یہاں آتے ہیں ٹیڈی لڑکے نہ ہمارے یہاں آتے ہیں اور سچ پوچھئے تو حضور ہمیں بھی ان کے بال بناتے اچھا نہیں لگتا نہ تمیز نہ تہذیب نہ ادب نہ لحاظ اسی گھٹن میں شاید انھوں نے دکان چھوڑ دی تھی اس کے بعد کچھ دنوں امین آباد میں اپنے شاگردوں کی دکانوں پر گھنٹہ دو گھنٹہ بیٹھتے رہے پھر وہ اپنے جانے پہچانے گھرانوں کے یہاں خود جاکر بال بنانے لگے ۱۹۷۶ء کے وسط میں جب کئی مہینے وہ بال بنانے نہیں آئے تو مجھے فکر ہوئی اور میں نے ادھر ادھر پوچھا تو معلوم ہوا کہ ان پر فالج کا اثر ہو گیا ہے میں ایک دن خیالی گنج میں ان کے گھر پر انھیں دیکھنے گیا تو ان بچارے کا بڑا برا حال تھا سارا بدن کپکپا رہا تھا بولنے میں بھی دشواری ہوتی تھی آواز صاف نہیں نکلتی تھی لیکن حواس بجا تھے انھوں نے دیکھتے ہی پہچان لیا اور لکھنؤ کی وہ تہذیب جو ان کی گھٹی میں پڑی تھی اس نے اس حالت میں بھی انھیں اٹھنے کی کوشش کرنے پر آمادہ کیا لیکن جسمانی مجبوری ذہنی آمادگی پر غالب آئی اور بچارے ہمک کر ہی رہ گئے ہم ایک دوسرے کو دیر تک ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہے۔ وہ معلوم نہیں کیا سوچ رہے تھے لیکن مجھے پرانے لکھنؤ کی تہذیب ہچکیاں لیتی نظر آرہی تھی میں زیادہ دیر تک نہ بیٹھ سکا اور رخصت ہو کر چلا آیا۔

اسمٰعیل صاحب پرانے لکھنؤ کی ایک یادگار تھے پڑھے لکھے بالکل معمولی

تھے لیکن زبان صاف ستھری تھی آداب اور تہذیب کا اتنا خیال رکھتے تھے کہ حضور قریب قریب ان کا تکیہ کلام ہو گیا تھا۔ وہ اپنے چھوٹوں سے بھی آپ جناب کر کے باتیں کرتے تھے ان کے پوتے جب اسکول سے ادھر شاید دادا جان سے پیسے مانگنے آتے تو وہ ان سے بھی بڑی تہذیب سے بات چیت کرتے وہ بچوں کے معاملہ میں بڑے خوش قسمت تھے ان کے بیٹے بڑی اچھی اچھی جگہوں پر ملازم تھے وہ جب ان کا ذکر کرتے تو ان کی چھوٹی گہری آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہو جاتی لیکن اس کے باوجود ان کے دل میں یہ کسک آخر تک رہی کہ اب اس فن کو سنبھالنے والا ان کے خاندان میں کوئی نہ رہا وہ بال بڑی توجہ اور لگن کے ساتھ بناتے بالوں کے اتار چڑھاؤ کا پورا خیال رکھتے۔ وہ اپنے خاص گاہکوں کے شہری کے بال نہیں بالکل ناک۔ کان اور بغل کے بال بھی بناتے اور جب کبھی کان کے بال کاٹتے وقت میں جھجکتا تو کہتے میاں ڈریئے نہیں یہ اناڑی ہاتھ نہیں ہیں قینچی چلاتے چلاتے قریب قریب تین بیسی بیت چکی ہیں۔

وہ اپنا حساب پکار رکھتے تھے لیکن گنتی نہیں جانتے تھے غالباً ۱۹۶۸ء میں جب میں نے ایک مرتبہ ان سے ان کی عمر کے متعلق پوچھا تو وہ کچھ حساب جوڑ کر بولے چار بیسی دو سال تین مہینے یعنی ۸۲ سال تین مہینے ۸۲ برس کی عمر کے باوجود وہ ساٹھا پاٹھا مثل کے مطابق کافی چاق چوبند تھے چھوٹا سا قد اکہرا بدن شانوں کے پاس ہلکا سا کوبڑ چوڑی پیشانی گہرائی میں چمکتی ہوئی آنکھیں

سانولا رنگ، پتلے لب، منھ دانتوں سے صاف مگر پوپلا منھ برا نہ لگتا تھا شاید ان کی تیز زبان نے بتیس دانتوں کے بیچ میں رہنا پسند نہیں کیا اسی لیے بہت جلد ان سے نجات حاصل کر لی ورنہ کان، آنکھ، زبان جسم سب جوانوں سے زیادہ مستعدی سے کام کر رہے تھے بدن اتنا چھریرا تھا کہ چلتے تو دوڑنے کا شبہ ہوتا زبان کا جہاں تک تعلق ہے تو وہ باتوں کے بادشاہ تھے لیکن کان بھی خوب کام دے رہے تھے وہ مطلب کی بات بہت جلد سن لیتے تھے بینائی کا یہ عالم تھا کہ اس عمر میں کبھی عینک کے مرہون منت نہ ہوئے اور آخر وقت تک عینک کی مدد لیے بغیر مزے میں بال کاٹتے اور ہم جیسے عینک کے غلاموں کو شرمندہ کرتے رہے ان کا لباس سادہ تھا پتلی مہری کا پائجامہ، منڈے گلے کا کرتا نیچی دیوار کی کبھی مخملی اور کبھی سوتی ٹوپی اور نیوکٹ جوتا پہنتے تھے اور پھدکتے ہوئے چلتے تھے۔

ایک دن جب گھر میں بال کاٹنے آئے تو ہم لوگ صحن میں بیٹھے تھے میں نے کہا آج نہیں بال کاٹیے تھوڑی دیر میں بادل چھا گئے اور کچھ اندھیرا سا ہو گیا میں نے کہا کہ آپ کو بال کاٹنے میں زحمت ہو رہی ہو گی بولے آپ لوگوں کی دعا اور اللہ کے کرم سے مجھے ایک ایک بال نظر آ رہا ہے آپ بے فکر رہیے خیر جہاں تک ہماری دعا کا تعلق ہے تو وہ اگر قبول ہوتی تو ہم

ہی کیوں عینک کے محتاج ہوتے رہا اللہ کا فضل وکرم وہ تو سبھی پر ہے اس لیے ہم نے کہا کہ آپ کی آنکھوں کی اس غیر معمولی بینائی کا کوئی راز ضرور ہے اس پر ان کی آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہوئی اور پتلے لبوں پر موٹی سی زبان پھیر کر انھوں نے کہا کہ یہ بینائی والدہ صاحبہ کی دین ہے انھوں نے لگ بھگ پانچ بیسی اور پندرہ سال کی عمر پائی لیکن انھوں نے سوئی میں تاگا اپنی بہو بیٹیوں سے ڈلوانا کبھی پسند نہیں کیا۔ میں نے کہا تو یہ کہیے کہ آپ کو یہ بینائی ورثے میں ملی ہے۔ کہنے لگے نہیں یہ اس سرمے کا معجزہ ہے جو والدہ حضور اپنے ہاتھ سے بڑی ریاضت کر کے بناتی تھیں۔ اس کے بعد انھوں نے پوری تفصیل سے اس بینائی بخش سرمے کی تیاری کا حال بتایا چونکہ میں بینائی کھو چکا تھا اس لیے میں نے سرمے کی تیاری کی تفصیلات یاد رکھنے کی کوشش نہ کی۔

اسمٰعیل صاحب کے باپ دادا ملیح آباد کے تھے لیکن وہ خود ڈیل ڈول اور بات چیت سے بالکل ملیح آبادی نہ معلوم ہوتے تھے بلکہ خاص پرانے لکھنؤ کی پیداوار نظر آتے تھے انہی سے معلوم ہوا کہ ان کے والد صاحب ۱۸۸۰ء کے لگ بھگ ملیح آباد سے لکھنؤ چلے آئے تھے اور جھوائیں ٹولے میں بس گئے تھے۔ وہاں اصطفٰے خاں صاحب کا خاندان ان کی سرپرستی کرتا تھا چار پانچ افراد پر مشتمل یہ چھوٹا سا

کنبہ بیس روپیے ماہوار کی آمدنی پر بقول ان کے "ستگی" کی عنایت سے مزے میں زندگی بسر کرتا تھا۔ انھوں نے اس وقت کی "ستگی" کا ذکر بڑے جوش و خروش سے کرتے ہوئے بتایا کہ حضور آپ یقین نہ کریں گے پانچ روپیے کا غلہ آدمی پیٹ نہیں ٹھیلے پر آتا تھا۔

انھوں نے بال کاٹنے کا فن سرکٹے نالے پر اپنے استاد حاجی چھٹن کی دکان پر سیکھا اس کے بعد وہ غالباً ۱۹۲۵ء میں قیصر باغ چلے آئے اور یہاں ان کی دکان ایسی چمکی کہ پورے شہر میں اسمٰعیل و اسحاق باربر کا طوطی بولنے لگا۔ اب نہ وہ دکان ہے نہ قدردان اور نہ اسمٰعیل نہ اسحاق.



اختر بجیا

ہماری اختر بجیا نہ کوئی قومی یا بین اقوامی شخصیت ہیں اور نہ کوئی فلمی شہرت کی مالک مقبول ایکٹریس بلکہ وہ اوسط درجے کے خاندان کی ایک فرد ہیں۔ لیکن اپنے محلے، پاس پڑوس اور کنبے والی نہیں بلا لحاظ عمر اور رشتہ سب کی چہیتی بجیا ہیں ان کی چاہت ان کی دولت کی دین نہیں کیونکہ دولت سے ان کی ہمیشہ دوری رہی کی یا دا للہ رہی نہ وہ ان کے پاس آئی اور نہ انھوں نے آگے بڑھ کر للک سے اسے پکارا۔ اس لیے دھن دولت سے ان کے تعلقات یہیں پر آکر ٹھپ ہو گئے کہ ؎

تمھیں غیروں سے کب فرصت ہم اپنے غم سے کب خالی
چلو بس ہو چکا ملنا نہ ہم خالی نہ تم خالی

وہ بچاری غم سے خالی رہتیں تو کیسے؟ اپنے گھر کے جنجال کے علاوہ انھیں ناتے رشتے اور محلے پڑوس کے دکھ درد اور شادی غمی کی تو فکر لگی رہتی

تھیں۔ اگر خود نہ جا سکتیں تو آنے جانے والیوں سے سب کی خیریت، خیر سلا تو ضرور ہی پوچھ لیتیں۔ اللہ نظر بد سے بچائے ان کے یہاں آنے جانے والوں کی کمی ہی کیا تھی۔ دیہات سے آنے والے رشتہ دار، مہمانوں کے علاوہ شہر میں محلے ٹولے اور جان پہچان کی منہ بولی بہنوں اور سہیلیوں کی آمد و رفت کا نہ ٹوٹنے والا سلسلہ صبح سے شام تک اس طرح قائم رہتا کہ ان کے میاں اپنی بیوی کی مقبولیت سے جل کر یا اپنے گھر کو ریلوے پلیٹ فارم میں تبدیل ہوتے دیکھ کر وکالت کا پیشہ چھوڑ سیاست کے میدان میں اس لیے کود پڑے کہ موکلوں اور مہمانوں سے ایک ساتھ پیچھا چھوٹ جائے اور وہ کسی تحریک میں شریک ہو کر شاہی مہمان کی حیثیت سے کچھ دن جیل میں سکون سے گزار سکیں۔

ابھی ابھی اختر بجیا اپنے ماموں زاد بھائی کی بیوی کی بہن کو ناشتہ کھلا کر رخصت کرنے کے بعد دم لینے کے لیے کمرے میں لیٹی ہی تھیں کہ دیوار پر کوا بولنے کی آواز کے ساتھ ہی ساتھ دروازے کی کنڈی کھٹکی اور ان کی نزہت بہن برقعہ سنبھالے باسکٹ ہاتھ میں لیے ہانپتی کانپتی پہنچیں اور بیٹھنے سے پہلے ہی بیتابی سے پوچھا بجیا نہیں نظر آ رہی ہیں کیا کہیں گئی ہیں۔؟

لڑکیوں نے چھیڑنے کے لیے کہا کہ بجیا اپنی سسرال گئی ہیں اس پردہ

کو پکڑ کر بولیں اے ہے! یہ کل کی چھوکریاں جن کے ابھی دودھ کے دانت بھی نہیں ٹوٹے ہمیں بنانے چلی ہیں۔ بچیا ری بجیا کی ساس سسر تو کب کے اللہ کو پیارے ہوگئے۔ گھر بھی کھنڈر ہوگیا۔ وہ سسرال کیا جائیں گی اب تو تم لوگوں کے سسرال جانے کے دن آگئے۔

دیکھو نا جب سے شمو کی بات پکی ہوگئی اس وقت سے چکر گھنّی ہو کر رہ گئی ہوں۔ ایک منٹ پیر نہیں رکتے ابھی گیارہ بھی نہ بجے ہوں گے بازار کے کئی پھیرے لگا چکی ہوں اب سیدھی کامدانی والے کے یہاں سے ادھر چلی آرہی ہوں۔ کچھ بھی نہ کرو پھر بھی شادی بیاہ میں سیکڑوں الم ٹنٹے ہوتے ہیں۔ اس زمانے میں ہم اوسط درجے کے لوگوں کے لیے تو بڑی مصیبت ہے۔ ہم لوگ رہتے تو جھونپڑیوں میں ہیں لیکن خواب دیکھتے ہیں محلوں کا۔

لڑکیوں نے کہا نسرہت خالہ قطع کلام معاف! اگر آپ مناسب سمجھیں تو اس میں ہماری ایک ترمیم منظور کرلیں۔ وہ یہ کہ ہم محلوں کا خواب خوشی سے نہیں دیکھتے بلکہ دیکھنے کے لیے مجبور ہوتے ہیں۔

بیٹی تم بالکل ٹھیک کہتی ہو ہم بیچ کے لوگوں کا شمار نہ جھونپڑوں میں ہوتا ہے نہ بڑوں میں۔ ہماری آمدنی کم تعلقات زیادہ ہوتے ہیں۔ چھوٹی جیب ہونے کے باوجود رکھ رکھاؤ بڑوں ہی جیسا رکھنا پڑتا ہے۔ پھر

شادی بیاہ کے موقع پر تو خاص طور پر ناک کٹنے کے ڈر سے اپنا پیٹ کاٹ کر سب ٹیم ٹام کرنا پڑتا ہے زمانے کے ساتھ ساتھ جہیز کی فہرست بھی بڑھتی جا رہی ہے پہلے زمانے میں جوڑے، زیور، برتن اور پلنگ پر دے ہی کا انتظام کرنا پڑتا تھا۔ اب نہ جانے کیا الا بلا ریڈیو سیٹ لیو سینکڑوں چیزیں فراہم کرنی پڑتی ہیں۔ پھر بھی کسر رہ جاتی ہے اور اس پر لطف یہ کہ نئے زمانے کے سامان کے ساتھ ساتھ ہم اوسط درجے کے لوگوں کو پرانی رسموں کو بھی نبھانا پڑتا ہے اور گرم کوٹ اور کمبل کے ساتھ رضائی دینا بھی ضروری خیال کیا جاتا ہے۔

میں نے کہا تھا کہ شبو کو شال، دوشالہ اور لحاف تو دیا ہی جا رہا ہے اب رضائی دینے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ مگر لوبڑھا کو کوئی کیا کہے! سنتے ہی بپھر گئیں۔ اور بولیں مجھے میکے سے چار رنگ کی چادر رضائیاں ملی تھیں۔ اور اب یہ دن آ گئے ہیں کہ اس گھر کی پوتی بے رضائی کے رخصت کر دی جائے وہ تو بس ہتا کہہ کر رخصت پا گئیں مگر میری جان جنجال میں پڑ گئی۔ رضائی کا کپڑا تو خیر چلو قوں آ ہی گیا لیکن رضائی پر گوٹ چڑھانا قیامت ہو گئی کوٹھے پر والے وکیل صاحب کی بیوی نے ساری گوٹ چوپٹ کر کے رکھ دی پہلے کہہ دیتیں کہ میں گوٹ کاٹنا نہیں جانتی تو کون ان کی ناک کٹ جاتی مگر چل نہ پا دیں کدن نام والی مثل۔ کاٹنا واٹنا

خاک نہیں جانتیں ۔ لیکن قینچی لے کر جٹ گئیں ۔ وہ تو کہو خیریت ہوئی کہ اسی وقت خیالی گنج والی خالہ آ گئیں ورنہ ساری گوٹ کتر کر رکھ دیتیں ۔ اتفاق کی بات سنجو خالہ جو رضائی اوڑھ کر آئی تھیں اسی پر اور یہی کاٹ کی ایسی صاف گوٹ چڑھی ہوئی تھی کہ آنکھیں جم کر رہ گئیں ۔ میں نے فوراً کہا خالہ ! اللہ آپ اپنی جیسی رضائی کی گوٹ ہماری بھی کاٹ دیجئے نا ! ہماری نکہت بہن کب سے ہلکان ہو رہی ہیں لیکن گوٹ کٹتی نہیں نظر آ رہی ہے ۔

اس خالہ نے اپنی آنکھیں ملتے ہوئے کہا یہ کون سی ٹم کی بات تھی ۔ میں منٹوں میں کاٹ دیتی مگر تمھیں نہیں معلوم جب سے آنکھوں میں پانی اترنا شروع ہوا ہے اس وقت سے سوائے سوالی کے اور کچھ نظر نہیں آتا ۔ تمھارا چاند جیسا چہرہ بھی دھلا ہی دھلا دکھائی دے رہا ہے ۔ اپنی رضائی پر گوٹ میں نے تھوڑی چڑھائی ہے اس کے لیے مجھے خاص طور پہ نعمت اللہ روڈ والی بجیا کے یہاں جانا پڑا ۔ گھر میں اللہ نظر بد سے بچائے ایک چھوڑ درجنوں سیانی سیانی لڑکیاں ہیں مگر کیا مجال جو کوئی بھولے سے بھی سوئی پکڑ لے آج کل کی لڑکیاں گوٹ چڑھانا تو بڑی بات ہے ٹھیک سے دو ڈوب لگانا بھی تو نہیں جانتیں سوائے مشین کھٹکھٹانے کے انھیں

کاج بنانا تک نہیں آتا۔ اللہ جیتا رکھے بجیا کو کہ ان کی وجہ سے پھر اس سال جاڑوں میں رضائی اوڑھنے کو مل گئی ورنہ آنکھوں نے تو ایسی دغا دی تھی کہ شاید رضائی اوڑھنا نصیب نہ ہوتی۔ اپنے گھر میں کیا محلے پڑوس میں گوٹ کاٹنے والی کوئی بی بی نہ ملیں تب مجبوراً مجھے بجیا کو تکلیف دینا پڑی۔ وہ بجیا رہی ایک بار والی مثل اپنے ہی بال بچوں کی بیماری آزادی سے دم مارنے کی فرصت نہیں پاتیں۔ اس پر میں دیکھتی ہوں کہ جیسے دیکھو کپڑا بغل میں دبائے بجیا کے گھر چلا آرہا ہے۔ مگر صاحب میں نے ایسی نیک دل بی بی نہیں دیکھی کہ کیا مجال کسی کو ٹال دیں اسی وجہ سے تو بجیا کہتے کہتے محلے پڑوس سب کا منھ نہیں تھکتا۔ وہ اپنے اسی اخلاق کی بنا پر جگت بجیا بن گئی ہیں چھوٹے بڑے سبھی ان کو بجیا کہتے ہیں۔ تعجب ہے کہ تم نہیں جانتیں۔

میں نے کہا کہ ارے! ہم اپنی اختر بجیا کو نہیں جانیں گے تو پھر کون جانے گا اس پر انھوں نے کہا تو پھر خواہ مخواہ کپڑا کیوں اکارت کروا رہی ہو انھوں نے یہ بات اس طرح پھٹاک سے کہہ دی کہ بیچاری وکیل صاحب کی بیوی شرم سے پانی پانی ہو گئیں۔ انھوں نے چپکے سے قینچی رکھ دی اور گوٹ لپیٹ کر میری طرف بڑھا دی۔ میں کہتی ہوں لوگ بے مروتی سے کیسے پھٹ سے منھ پر بات کہہ دیتے ہیں۔ میں تو چاہے پورا اکبر اباد

ہو جاتا کبھی اس طرح نہ کہہ سکتی۔

لڑکیوں نے مسکراتے ہوئے کہا کہ خالہ بات یہ ہے کہ آنکھوں میں پانی اترنے سے آب آید تیمم برخاست کی طرح مروت رفو چکر ہو جاتی ہے۔

وہ بولیں نہ کہیں! مجھے تو پانی وانی کچھ نظر نہیں آیا۔ کوڑی جیسے دیدے پھلا کر باتیں کر رہی تھیں۔ میں تو سمجھتی ہوں۔ اپنی بلا بجیا پہ ٹال دی یا پھر سر سے گوٹ کاٹنا ہی نہ جانتی ہوں گی شان میں بٹہ لگ جانے سے پانی اترنے کا بہانہ کر دیا۔ وہ تو ہماری اختر بجیا ہی کا حاتم دل ہے کہ کبھی کوئی مایوس نہیں لوٹتا۔

لڑکیاں بجیا کی تعریفیں سن رہی تھیں اور مسکرا رہی تھیں کیونکہ گوٹ کٹانے مونڈھے چڑھوانے اور گلا بنوانے سے پہلے بہر آنے والی بی بی کے منہ سے بجیا کی شان میں اس طرح کے رنجیدہ قصیدے بارہا سن چکی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ کام کی بھرمار اور بیماری آزاری کے تکان کے باوجود یہ تعریفیں بجیا کے لیے ایسے زبردست ٹانک کا کام کرتیں کہ رگوں میں خون دوڑنے لگتا، تھکے چہرے پر تازگی آجاتی اور وہ تازہ دم ہو کر کپڑا کاٹنے بیٹھ جاتیں۔

بجیا جو کمرے میں درد کی وجہ سے منہ لپیٹے کمرے میں لیٹی تھیں

پیٹھ پیچھے برائی نہیں تعریفیں سن کر کروٹیں بدلتے اور انگڑائیاں لیتے لگیں۔ اور محض یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ وہ سو نہیں جگ رہی ہیں بار بار کھانسنے لگیں اندھا کیا چاہے دو آنکھیں نزہت بہن نے جو بجیا کو کنمناتے اور کھانستے سنا تو چٹ گوٹ بغل میں دبا سیدھی کمرے میں جا دھمکیں اور بلائیں لے کر خیریت دریافت کرنے لگیں اختر بجیا انھیں دیکھ کر فوراً اٹھ کر بیٹھ گئیں اور کمزور آواز میں بولیں۔ بہن نزہت! کیا کہوں اس موئی پیچش نے تو زندگی اجیرن کر دی ہے۔ کبھی پنڈلیاں اینٹھ رہی ہیں کبھی کمر ٹوٹی جا رہی ہے۔ کبھی درد سے سر پھٹا جا رہا ہے کبھی چکر آ رہا ہے تو کبھی غشی طاری ہو رہی ہے نگوڑی پیچش نہ ہوئی بلا ہو گئی کہ جوڑ جوڑ اور روئیں روئیں تک اس کا اثر پہنچ جاتا ہے۔

نزہت:۔ اختر بجیا! گستاخی معاف، پیچش میں پیٹ میں مروڑ ہو جانا چاہیے نہ پنڈلی اور کمر میں اینٹھن یہ تو یہی ہوا، مارو گھٹنا پھوٹے آنکھ۔

اختر بجیا:۔ بہن ٹھیک کہتی ہو جب پہلے پہل ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے کہا کہ پنڈلی کی اینٹھن اور کمر کا درد یہ سب پیچش کے کرشمے ہیں ہکا بکا ہو کر ان کا منھ تکنے لگی وہ مجھے اس طرح اچنبھے میں دیکھ کر

سمجھ گئے اور کہنے لگے پیچش پرانی ہو جانے پر آسیب بن جاتی ہے اور
رگ رگ میں سرایت کرکے وہ کرتب دکھاتی ہے کہ لوگ اسے بیماری کے
بجائے بُرا سایہ سمجھ کر دوا چھوڑ جھاڑ پھونک کرانے لگتے ہیں مجھے ان
کی بات پر یقین نہ آیا لیکن میں نے دیکھا کہ جب تک پیچش کی دوا
کھاتی اور پرہیز کرتی رہتی ہوں، پنڈلی کی اینٹھن اور سر کا چکر سب
مدھم رہتے ہیں تو بہن میں بھی قائل ہوگئی اور کبھی تکلیف ہوتی ہے انہی کی
بتائی دوا کھا لیتی ہوں۔

نزہت :۔ تو پھر بجیا جلد دوا کیوں نہیں لیتیں اپنے کو خواہ مخواہ
کیوں ہلکان کر رہی ہو؟

اختر بجیا۔ دونوں لڑکے اسکول چلے گئے ہیں رمضان نہیں معلوم
کتنی مرتبہ میرے ساتھ ڈاکٹر صاحب کے یہاں جا چکا ہے لیکن
جب اسے اکیلا بھیجو تو یہ راستہ بھول جاتا ہے اور صبح کا بھولا پھر شام
ہی کو آتا ہے تو بھلا بہن! تمہیں بتاؤ کہ اسے بھیج کر کوئی کاہے کو اپنی
جان جنجال میں ڈالنے لگا۔

نزہت بہن یہ سنتے ہی بگڑ کر اٹھ کھڑی ہوئیں اور کہنے لگیں غضب
خدا کا دو، دو پڑھی لکھی لڑکیاں گھر میں موجود اور ماں ہیں دادا کے
پلنگ پر تڑپا کریں۔ بھلا ان کی پڑھائی لکھائی پھر کس دن کام آئے بغیر

گی۔ کالج میں پڑھنے والی لڑکیوں کا تو بس دھوبی کے کتے جیسا حال ہے نہ گھر کی نہ گھاٹ کی۔

اس پر لڑکیوں کو صبر نہ ہوا اور بڑی لڑکی بولی نزہت خالہ! گھر میں آپ کی بجیا ہاتھ لگانے نہیں دیتیں۔ انھیں کسی کے ہاتھ کا کوئی کام پسند ہی نہیں آتا خواہ مخواہ کوئی نہ کوئی خرابی نکال ہی دیتی ہیں رہا گھاٹ وہاں جانے لگیں تو آپ لوگ سر پکڑ کر دہائی دینے لگتی ہیں اور کہنے لگتی ہیں کہ اے ہے! اب شریف گھر کی لڑکیاں ہاٹ، بازار کے چکر لگانے اور سودا سلف خریدنے لگیں اس پر الٹا یہ الزام کہ پڑھی لکھی لڑکیاں نہ گھر کی نہ گھاٹ کی۔

نزہت خالہ نے لڑکیوں کے منھ لگنا مناسب نہ خیال کیا اور خون کا گھونٹ پی کر خاموش رہیں۔ پھر برقعہ سنبھالتی ہوئی بولیں لاؤ رضو بجیا! مجھے نسخہ دو میں ڈاکٹر صاحب سے حال بتا کر ابھی دوا لیے آتی ہوں۔

اختر بجیا گھبرا کر، نوج بہن! تم کہاں جاؤ گی۔ میری طبیعت کچھ سنبھل گئی ہے شام کو خود ڈاکٹر صاحب کو دکھا کر دوا لے آؤں گی۔ اب تو شاید ڈاکٹر صاحب مطب سے چلے بھی گئے ہوں گے۔

نزہت۔ ڈاکٹر صاحب چلے گئے ہوں گے تو کیا اپنے ساتھ دوا خانہ بھی لیتے گئے ہوں گے اور فرض کرو ان کا دوا خانہ بند بھی ہو گیا ہو گا تو کیا نسخہ دوسرے دوا خانہ میں نہیں بندھ سکتا ایمن آباد میں تو اللہ نظر بد سے بچائے اب ہر چالیس قدم پہ دواؤں کی ایسی شاندار دوکانیں کھل گئی ہیں کہ بے بیماری دوا خریدنے کو دل چاہنے لگتا ہے۔

اس پر لڑکیوں نے ہنستے ہوئے کہا، بجیا آپ کیوں روکتی ہیں نزہت خالہ دوا لینے نہیں شاندار دوکانیں دیکھنے کے شوق میں جا رہی ہیں۔

نزہت خالہ بگڑ کر بولیں لو ج! میں نئے زمانے کی لڑکیوں کی طرح ندیدی نہیں ہوں کہ دوکانیں جھانکتی پھروں۔ مگر ضرورت پڑنے پر میں پاؤں کٹائے گنج بنی بیٹھی بھی نہیں رہ سکتی۔

اختر بجیا۔ بہن نزہت! تم ان سنڈی لڑکیوں کی بات کا برا نہ مانو نہ چھوٹا دیکھیں نہ بڑا، یونہی ہر شخص سے ہنسی مذاق کرنے لگتی ہیں اس کے بعد انھوں نے ان کے ہاتھ سے برقعہ چھین کر الگنی پر ٹانگ دیا اور کہا یہ تو بتاؤ بہن اس وقت ادھر کیسے آنکلیں؟

نزہت۔ ادھر آنکلیں کا کیا مطلب؟ میں تو خاص طور پر اپنی اختر بجیا سے ملنے نہیں بلکہ انھیں تکلیف دینے آئی ہوں ورنہ

بہن! مجھے کہیں آنے جانے کی کیا دم مارنے کی فرصت نہیں۔ تم جانتی نہیں ہو شمو کی شادی کی تاریخ سر پر آگئی ہے۔ صرف ایک مہینہ رہ گیا ہے اور سب سینا پرونا اسی طرح پڑا ہے خیر اور سب کام تو کسی نہ کسی طرح نپٹ ہی جائیں گے لیکن اختر بجیا! رضائی کی گوٹ کاٹنا میرے بس کی بات نہیں اور جس سے کہو وہ کانوں پر ہاتھ رکھنے لگتا ہے اور کاٹنے کے لیے تیار نہیں ہوتا کوٹھے پر والے وکیل صاحب کی بیوی مارے شیخی کے قینچی لے کر گوٹ کاٹنے بیٹھ گئیں لیکن جب اینڈے بینڈے ہاتھ چلانے لگیں تو میرا دل دھک سے ہو گیا کہ اللہ خیر کرے کہیں اچھا خاصا کپڑا ستیاناس نہ کر دیں۔

اللہ کو گوٹ بچانی منظور تھی اس لیے اسی وقت خیالی گنج والی خالہ فرشتہ رحمت بن کر آگئیں اور انھوں نے کہا کہ تم گوٹ کے لیے کاہے کو پریشان ہوتی ہو کیا تم نہیں جانتی کہ تمھاری اختر بجیا رضائی کی ایسی گوٹ کاٹتی ہیں کہ لوگ تماشا دیکھیں وہ اتفاق سے جو رضائی اوڑھے ہوئے تھیں اس میں آپ ہی کے ہاتھ کی گوٹ چڑھی ہوئی تھی۔ نہ کہیں جھول نہ کان اب ایسی سڈول گوٹ تو شاذ و نادر ہی نظر آتی ہے۔

لڑکیاں کمرے کے باہر سے یہ باتیں سن رہی تھیں اور مسکرا کر کہہ رہی تھیں کہ اب کیا ہے؟ اب تو بجیا کمر کا درد اور ہینڈ لیول کی اینٹھن سب بھول جائیں گی اور بالکل چاق چوبند ہو کر گوٹ کاٹنے بیٹھ جائیں گی۔ جس طرح شاعر اپنے شعر کی تعریف سننے کے لیے ہر زحمت اٹھانے کے لیے تیار ہو جاتا ہے اسی طرح بجیا کپڑے کی کتر بیونت میں اپنی مہارت کی تعریف سن کر سب درد دکھ بھول جاتی ہیں۔

لڑکیاں کمرے کے باہر یہ کہہ رہی تھیں اور کمرے کے اندر بجیا کی قینچی گوٹ پر بڑی روانی سے چل رہی تھی۔ اینٹھن اور درد دور ہو چکا تھا اور چہرہ فخر و مسرت سے چمک رہا تھا۔



دادی اماں

ہماری دادی اماں تھیں تو بوڑھی لیکن بڑی کلے ٹھلے کی بی بی تھیں مجال کیا کہ ان کی اجازت کے بغیر کوئی فقیر کو بھیک دے دے وہ مرغیوں سے لے کر لڑکے لڑکیوں اور حد یہ ہے کہ اپنے بوڑھے صاحبزادے کی نقل و حرکت پہ بھی نگاہ رکھتی تھیں۔ بہوؤں کو تو وہ خاطر ہی میں نہ لاتیں تھیں ان کا کہنا تھا کہ جب تک میں زندہ ہوں اس وقت تک اس گھر کی مالک میں اور تنہا میں ہوں۔ بہو بیٹیاں اچھا سے اچھا کھائیں اور پہنیں لیکن اگر کسی نے حاکمیت جتائی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔

[illegible] یہ تھی کہ کنجیوں کا بھاری گچھا وہ اپنے ہی کمر بند میں ہر وقت باندھے رہتی تھیں وہ بیچوں بیچ بارہ دری میں اپنے چھپر کھٹ پر گاؤ تکیہ لگائے ازار بند میں بندھا کنجیوں کا گچھا

سامنے رکھے وزیر خارجہ بنی بیٹھی رہیں۔ گچھا ان کے اقتدار اعلا کا سمبل (نشان) سا بن گیا تھا۔ بہو، بیٹیوں کو جب کوئی چیز نکالنی ہوتی تو وہ ان کے دربار میں حاضر ہوتیں اس وقت دادی اماں کے چہرہ پر فخر و مسرت کی ایک لہر سی دوڑ جاتی اور تھوڑی دیر کے لیے ان کے چہرے کی تمام جھریاں غائب ہو جاتیں۔

لیکن اس گچھے کی گمشدگی سے دن میں ایک آدھ مرتبہ ہنگامہ ہونا ضروری تھا۔ ہوتا یہ کہ فرض کیجئے کہ بڑی بہو گچھا مانگ کر لے گئیں اسی درمیان تھوڑی دیر میں کسی ضرورت سے چھوٹی بہو نے گچھا مانگا۔ اب دادی اماں بالکل بھول گئیں کہ گچھا کس کو دیا تھا؟ اور یہ بھی خیال سے اتر گیا کہ دیا بھی تھا یا نہیں؟ پھر کیا تھا۔ ازار بند نوچا جا رہا ہے دوپٹے کا آنچل دیکھا جا رہا ہے۔ پاندان کی کوٹھیاں، کوٹھیاں جھانکی جا رہی ہیں بچوں کو صلواتیں سنائی جا رہی ہیں۔ نوکرانیوں کو کوسنے دیئے جا رہے ہیں۔ اڑن گھاٹیوں میں اس شبہے کا بھی اظہار کیا جا رہا ہے کہ کسی دشمن نے شاید چوری کرانے کی غرض سے گچھا غائب کرا دیا۔ ہاں! بھائی دشمنوں کی آنکھوں میں ہمارا بھرا پرا گھر کانٹے

کی طرح کھٹکتا ہے چاہتے ہیں کہ ہمارے یہاں بھی چوہے ڈنڈ پیلنے لگیں۔ دادی اماں دامن پھیلائے یہ کہتی ہوتیں اے اللہ ہم نے صبر کیا پر تو نہ صبر کر کہ اتنے میں بڑی بہو گچھا اگلدان کے پھیلے ہوئے آنچل میں ڈال دیتیں اور دادی اماں کی زبان میں یک دم بریک لگ جاتا اور شرمندگی سے ادھر ادھر دیکھنے لگتیں کہ کوئی ان کی اس بھول پر مسکرا تو نہیں رہا ہے۔

ایک دن گچھا ازار بند میں باندھنے کے بجائے دوپٹے کے کھونٹ میں باندھ لیا اور حسب عادت بھول گئیں جمعہ کا دن تھا دھوبن آنے والی تھی کسی نے دوپٹہ میلے کپڑوں کے ڈھیر میں ڈال دیا اب کیا تھا۔ پاندان، بستر اور تکیے کی تلاشی کے بعد اگلدان، چلمچی حتیٰ کہ قدمچہ تک جھنکوا لیا گیا۔ لیکن گچھا نہ ملنا تھا نہ ملا اب تک کسی نے کوئی خاص اہمیت اس لیے نہ دی تھی کہ یہ تو روزانہ کا دستور ہو گیا تھا۔ خیال تھا کہ گچھا آخر کار کسی نہ کسی کے پاس مل ہی جائے گا لیکن جب گھر بھر کی پوچھ گچھ کے بعد بھی اس کا سراغ نہ لگا تو لوگوں کو فکر ہوئی اور اب واقعی اس کی تلاش شروع ہوئی ابھی بستر اٹھے اور بکس جھانکے جا رہے تھے کہ اللہ نے بڑا کرم کیا کہ دھوبن کو فرشتہ رحمت بنا کر بھیج دیا اور گچھا دوپٹہ

کے کھونٹے میں بندھا مل گیا ورنہ گھر والوں کا کھانا پینا حرام ہو جاتا۔

دادی اماں کو اگر اپنے پوتوں میں سے کسی ایک کو پکارنا ہوتا تو وہ بلامبالغہ چاروں پوتوں کے نام لے ڈالتیں تب جا کے انھیں صحیح نام یاد آتا۔

ایک دن تو کمال ہی ہو گیا دادی اماں کو جب کسی چیز کو قریب سے دیکھنا چاہتیں تو وہ موٹے شیشوں والی اپنی عینک ناک سے اٹھا کر ماتھے پر چڑھا لیتیں۔ ایک مرتبہ عینک ناک سے اٹھا کر ماتھے پر چڑھا کر بھول گئیں اور شور مچانے لگیں لو بھئی اب ہماری عینک پر بھی ہاتھ صاف ہونے لگا۔ اب اس گھر میں تو کوئی چیز اپنی جگہ رہی نہیں سکتی۔ غضب ہے دیکھتے ہی دیکھتے میری عینک الوپ ہو گئی میرے اللہ اب میں کیا کروں گی۔ ایسے ہی کیا سوجھتا تھا اب تو سوائی بھی نظر نہیں آتی۔

میں ادھر سے گزرا تو میں نے دیکھا کہ عینک ماتھے پہ چڑھی ہوئی ہے اور دادی اماں عینک کی تلاش میں پسینے پسینے ہو رہی ہیں۔

میں نے بڑی ہنک سے کہا دادی اماں پیشانی سے پسینہ پوچھئے عینک تو مل ہی جائے گی آپ ہلکان کیوں ہو تی ہیں انھوں نے جیسے

ہی پسینہ پوچھنے کے لیے پیشانی پر ہاتھ رکھا عینک واقعی مل گئی۔

میں نے کہا دادی اماں، بغل میں لڑکا شہر میں ڈھنڈھورا، والی مثل کا کیا مطلب ہے؟ اس کے بعد میں صلوٰتوں کا سلسلہ شروع ہونے سے پہلے ہی رفو چکر ہو گیا۔



نصن بھائی

ہمارے نصن بھائی کا نام دراصل محمد نصیر ہے لیکن ہم لوگ انھیں محبت میں نصن بھائی کہتے ہیں۔ وہ اپنے نام سے خوش نہیں ہیں کیونکہ ان کا خیال ہے کہ اس میں پرانا پن پایا جاتا ہے۔ وہ اس کے بالکل خلاف ہیں کہ لڑکے کا نام خود لڑکا نہ رکھے بلکہ ماں باپ رکھیں۔ جو نام رکھ کر الگ ہو جاتے ہیں اور لڑکا زندگی بھر اس نام سے پکارا جاتا ہے جو نہ اس کی مرضی سے رکھا گیا ہے نہ اس کے مشورے سے بلکہ وہ اسے ناپسند بھی کرتا ہے۔ لڑکے کا یہ پیدائشی حق ہے کہ وہ اپنا نام خود اپنی پسند اور ذوق کے مطابق رکھے اسے اس جائز حق سے محروم کرنا اس کے ساتھ سخت ناانصافی ہے۔

چنانچہ جب وہ سن بلوغ کو پہونچے تو انھوں نے اپنے والد صاحب کو ایک خط لکھا جس میں انھوں نے بڑے ادب سے درخواست کی

کہ والد صاحب آپ جانتے کہ میں نے آج تک آپ سے کوئی بات نہیں چھپائی حقیقت یہ ہے کہ میں اپنے دل میں کوئی بات رکھ ہی نہیں سکتا۔

جو دل میں وہ زبان پر اللہ جانتا ہے۔ قدرت نے میرا دل بند کوٹھری نہیں بلکہ کھلا ہوا برآمدہ بنایا ہے جس کی ہر چیز عیاں ہے اسی لیے جب بری صحبت میں پڑکر مجھے سگریٹ پینے کی عادت پڑ گئی تو میرا ضمیر اس وقت تک ملامت کرتا رہا جب تک میں نے خط کے ذریعہ آپ کو اس کی اطلاع نہ کر دی اور میری وہ خوشی قسمتی ہے کہ مجھے آپ جیسا فراخ دل باپ ملا ہے جس نے ہمیشہ درگذر سے کام لیا اور کوئی بات پر اثر آمریت سے کام لیتے ہوئے مجھ پر زبردستی عائد کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یہاں میرے جتنے ساتھی ہیں ان میں قریب قریب سب کے نام نئے طرز کے ہیں کسی کا نام نصرت الاکرام ہے کسی کا احمد کمال اور کسی کا اختر جمال ہے۔ ان نئے ناموں کے ساتھ میرا پرانا محمد نصیر نام کارس کے ساتھ بالکل بیل گاڑی معلوم ہوتا ہے اس لیے اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنے نام کی اوور ہالنگ کرا کے اسے نیا روپ دیدوں اور محمد نصیر کے بجائے اسے نصیر خیام کر دوں۔

خود نفیس بھائی کا کہنا ہے کہ اس کے جواب میں ان کے والد صاحب نے فطری فراخ دلی کا ثبوت دیتے ہوئے لکھا تمہیں اپنا نام رکھنے کی پوری آزادی ہے، میں نے تمھارا نام تمھاری رائے اور مشورے کے بغیر اپنی خوشی سے نہیں بلکہ اس مجبوری کی بنا پر رکھا تھا کہ اس وقت تم غوں غاں کرنے کے سوا اپنی رائے کے اظہار سے بالکل معذور تھے اور میں اپنے نام سے تمھارا عقیقہ کر نہیں سکتا تھا۔ اس لیے اس وقت ہماری جو سمجھ میں آیا تمھارا نام رکھ دیا اب تم عاقل و بالغ ہو گئے ہو تمھیں اپنی مرضی کے مطابق اپنے نام میں ترمیم اور تبدیلی سے میں کیسے روک سکتا ہوں تمھیں پورا اختیار ہے کہ تم اپنے نام کی جس طرح چاہو اور ہالنگ کراؤ ہاں اگر کسی وقت تمھیں نئے نام کے ساتھ پرانی ولدیت ناپسندیدہ ہو محسوس ہو تو اس کا خیال رکھنا کہ یہ معاملہ ذرا نازک ہے اس میں اپنی والدہ کی مرضی کے بغیر تبدیلی نہ کرنا۔

ہمارے نفیس بھائی جدت پسند ہونے کے باوجود سعادت مند بھی ہیں اس لیے انھوں نے اپنے والد صاحب کے اس جواب کے بعد نام کی اور ہالنگ کا خیال ترک کر دیا اور بڑی سعادت مندی سے اپنے آوٹ آف ڈیٹ نام کو گلے کا ہار بنائے رہے ہیں۔

ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی زبان ان کے دل کا آئینہ ہے چاہے جیسے بھی الٹی سیدھی بات ہو اگر دل میں آگئی تو اس کا زبان پر آنا ضروری ہے۔ اس کے لیے موقعہ محل کی کبھی کوئی قید نہیں نجی صحبت ہو یا عام محفل وہ دل میں آنے والی ہر بات زبان پہ لائے بغیر رہ نہیں سکتے۔

یہی وجہ ہے کہ وہ ملنے کے چند ہی منٹ بعد اتنے بے تکلف ہو جاتے ہیں کہ اس منزل پہ پہونچنے کے لیے عام طور پر برسوں کی میل ملاقات درکار ہوتی ہے۔

میری ان کی ملاقات اس طرح ہوئی کہ ایک جگہ جہاں بہت سے لوگ جمع تھے جن میں بے تکلف دوست بھی تھے اور محترم بزرگ بھی جب میں وہاں پہونچا تو ایک صاحب نے ان سے میرا تعارف کرایا۔ میرا نام سنتے ہی نفن بھائی کی باچھیں کھل گئیں اور انھوں نے فرمایا کہ بے تکلفی معاف کیجئے گا حقیقت یہ ہے کہ مجھے آپ کا نام اس قدر پسند ہے کہ اس مرتبہ اگر میرے لڑکا پیدا ہوا تو میں اس کا نام یہی رکھوں گا۔ میں نے عرض کیا کہ معلوم نہیں لڑکا پیدا ہو کہ لڑکی اس لیے خواہ مخواہ آپ انتظار کی زحمت کیوں گوارا کریں اور مجھی کو گود کیوں نہ لے لیں اس پر ایک قہقہہ ہوا اور انھوں نے خوش ہو کر

مجھے گلے لگا لیا۔

کہنے والی بات ہو یا نہ کہنے والی بات ہو نصن بھائی کہے بغیر رہ نہیں سکتے۔ شادی کے بعد جب وہ چوتھی میں سسرال گئے تو انھوں نے محسوس کیا کہ ان کی بیگم اور سالے سالیاں سب کی سب قد میں ان سے کافی اونچے ہیں کوئی اور ہوتا تو اپنی کمزوری کو چھپانے کی کوشش کرتا مگر ان کے دل میں آئی بات زبان پہ آنا ضروری تھی اس لیے بلا سوچے سمجھے فرمانے لگے کہ میں تو یہاں ایسا معلوم ہوتا ہوں جیسے کہ عرب کے نخلستان میں دسہری کا درخت لگا دیا گیا ہو۔ اس پر ایک شوخ لڑکی نے کہا دولہا بھائی اب تو دسہری کی قلم ہر پیڑ میں لگائی جانے لگی ہے اب اگر تاڑ میں لگا دی جائے تو دسہری کی مٹھاس میں سرور کا اضافہ ہو جائے گا۔

یہ جملہ سن کر ہمارے نصن بھائی پر واقعی سرور کا عالم طاری ہو گیا اور انھیں یہ دیکھنے کا ہوش ہی نہ رہا کہ کچھ لڑکیاں ان کے پیچھے کھڑی ہوئی ایڑی اٹھا اٹھا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہی ہیں کہ نصن بھائی کا سر صرف ان کے کاندھوں تک پہونچتا ہے۔

نصن بھائی کو میں نے کبھی خاموش بیٹھے نہیں دیکھا کوئی بھی محفل ہو اور کسی موضوع پر بحث ہو رہی ہو وہ زیادہ دیر صبر نہیں کر سکتے

اور ذرا سا موقعہ پاتے ہی نہ صرف یہ کہ بحث میں شریک ہو جاتے ہیں بلکہ زور شور سے تقریر شروع کر دیتے ہیں کہ بحث کرنے والوں کو کنارہ کش ہو جانا پڑتا ہے اور نصن بھائی میدان خالی پا کر چوکڑیاں بھرتے ہوئے ایسی چھلانگ مارتے ہیں کہ موضوع بحث گر کر چکنا چور ہو جاتا ہے اور یہ فراٹے بھرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں اور مڑ کر اس کی خیریت کبھی نہیں پوچھتے وہ جب زیادہ جوش میں آتے ہیں تو انھیں اپنی مادری زبان کا دامن تنگ نظر آنے لگتا ہے اور وہ انگریزی زبان میں بولنے لگتے ہیں اور اگر شامت کا مارا کوئی ساتھی بیچ میں ٹوک دیتا ہے تو بحث چھوڑ کر اس کی خبر لینے کے لیے آستین چڑھا کر آمادہ بہ جنگ ہو جاتے ہیں لیکن نصن بھائی کو گرجتے سبھی نے سنا ہے مگر برستے کسی نے نہیں دیکھا وجہ یہ ہے کہ وہ بات کی طرح دل میں دیر تک غصہ بھی نہیں رکھ سکتے۔ ان کے کھلے دل میں غصہ آندھی کی طرح آتا ہے اور چڑھی ندی کی مانند منٹوں میں اتر جاتا ہے۔

جگت باجی

ایسی خواتین بڑے کام کی ہوتی ہیں جو گھر گرہستی کے جھمیلے میں نہیں پڑتیں اور اپنا سارا وقت خلق خدا کی خدمت میں صرف کر دیتی ہیں۔ ایک قصبے میں ایک خاتون تھیں وہ گھر گرہستی سے خود نہیں بھاگیں بلکہ قدرت نے انھیں بھگا دیا۔ مطلب یہ کہ ان کا بیاہ بھی ہوا بچے بھی ہوئے مگر قسمت کی خوبی سے میاں نکھٹو ملے تھے۔ وہ بچے تو بڑی مستعدی سے پیدا کرتے تھے مگر پیسہ پیدا کرنے سے کوسوں دور بھاگتے تھے اسی لیے انھوں نے بچے پیدا کرنے کا کام اپنے ذمہ اور ان کے پالنے پوسنے کا کام سسرال والوں پر ڈال دیا تھا اللہ جھوٹ نہ بلائے ان کی بیوی بیاہ کے بعد قسم کھانے کے لیے صرف ایک مرتبہ سسر کے انتقال پر تعزیت کے لیے سسرال گئی تھیں اور کھڑی سواری واپس آ گئی تھیں۔ تھوڑے دنوں تک نکھٹو میاں سے لشتم پشتم

انھوں نے نباہ کیا لیکن گاڑی زیادہ دلوں نہ چل سکی اور چھٹم چھٹا ہو گیا۔

دو بچے باپ کی لاپروائی سے بیزار ہو کر بچپن ہی میں اللہ کو پیارے ہو گئے تھے، دو لڑکے جو بچ گئے تھے انھیں بے اولادی خالہ نے بچپن سے لے لیا تھا اور یہ خاتون بیاہ اور بچوں کے باوجود گھر گرہستی کے جھمیلے سے دامن بچا کر صاف نکل گئیں۔ ایسی بات نہیں کہ وہ کاہل اور کام چور تھیں حقیقت تو یہ ہے کہ وہ بڑی مستعد اور بڑی کام کاج تھیں، یہی وجہ ہے کہ رشتے ناتے، پاس پڑوس، جان پہچان کسی کے یہاں بچہ ہونے والا ہوتا تو ولادت سے دو ایک دن پہلے باجی کو بلا لیا جاتا وہ گھر میں تو باجی کہی جاتی ہی تھیں اس کے علاوہ قصبے کے سبھی لوگ محبت میں انھیں باجی ہی کہتے تھے اس طرح وہ جگت باجی ہو گئی تھیں۔ کچھ اپنا تجربہ اور کچھ اپنے حکیم بھائی سے پوچھ پاچھ کر زچہ بچہ کی دوا دارو اور دیکھ ریکھ میں ایسی ماہر ہو گئی تھیں کہ دائیاں بھی ان سے صلاح لیتیں اور وہ بڑی خوشی سے صلاح دیتیں ان کی کمزوری تعریف تھی وہ تعریف کے علاوہ کسی چیز کی بھوکی نہ تھیں۔

اس زمانے میں نہ اتنے زیادہ اسپتال تھے اور نہ لوگ اسپتال جانے کے عادی۔ دیہات میں لوگوں کو اسپتال کے نام سے بخار چڑھ آتا تھا۔ ایک تو زمانہ اسپتال سوائے بڑے شہروں کے چھوٹے شہروں اور

قصبوں میں خال ہی خال تھے۔ دوسرے وہ خواتین جن کے لیے ایک گھر سے دوسرے گھر جانے کے لیے ڈولی دروازے پر لگائی جاتی تھی وہ بھلا بچے کی ولادت کے سلسلے میں باہر کاہے کو جاتیں۔ اس زمانے میں دیہات میں سنور کا عجب نقشہ ہوتا تھا۔ جاڑے ہوں یا گرمی کا موسم زچہ کو ہمیشہ بند جگہ پر لٹایا جاتا تھا۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ باجی کی سب سے بڑی بہن کے پلوٹھی کا بچہ جب پیدا ہوا تو بڑی دھوم دھام ہوئی ہم بھی امی کے ساتھ دیکھنے گئے تھے۔ باجی کی بہن کا پلنگ بڑے تدرے کے بغل والی صحنچی میں بچھا تھا، صحنچی کا بڑا در جو آنگن کی طرف تھا اس پر موٹے ٹاٹ کی پٹیوں کا لمبا سا پردہ پڑا تھا اور تین چھوٹے در جو تدرے کی طرف تھے ان میں تولی رنگ کا پردہ جس کے کنارے لواڑ لگی تھی بندھا ہوا تھا۔ مئی کا پہلا ہفتہ تھا اچھی خاصی گرمی پڑنے لگی تھی لیکن اس کے باوجود بڑے در کے سامنے لکڑی کا ایک بڑا کندہ دن رات برابر سلگتا رہتا تھا۔ زچہ بچہ کو برے سائے سے بچانے کے لیے دیواروں پر لکھے ہوئے تعویز چپکائے تھے، سرہانے کی طرف پلنگ کی پٹی میں تعویز بندھے ہوئے تھے اس کے علاوہ زچہ کے بازو اور گلے میں موم جامے کیے ہوئے تعویز لٹک رہے تھے۔ ایک خاص چیز جو زچہ کے پلنگ پر ہمیں نظر آتی تھی وہ بندر کی کھوپڑی تھی جس پر کڑوا تیل

چھڑا ہوا تھا۔ مغرب کی اذان ہوتے ہی زچہ خانے میں ایک بزرگ کے مزار سے خاص طور سے منگائے ہوئے لوہے کے چوگتیا چراغ کی بتیاں کڑوا تیل ڈال کر جلادی جاتیں، زچہ خانے کے پاس عشاء کی نماز کے بعد مولوی صاحب روزانہ دستک دینے آتے۔ رات کے وقت زچہ خانے میں ناون، بکسورن کے علاوہ گھر کی ایک عورت بھی رہتی تھی۔ رات بھر باری باری ایک عورت کا جاگتے رہنا ضروری تھا یہ سب احتیاطی تدبیریں بچے کو جموگو سے بچانے کے لیے کی جاتی تھیں۔

ہماری باجی اس زمانے کے زچہ خانہ کے ان تمام لوازمات سے اچھی طرح واقف تھیں جہاں جاتیں اگر کوئی کمی دیکھتیں اسے فوراً پورا کراتیں۔ عام طور پر بچے کی ناف بکسورن کاٹتی تھی لیکن باجی نے یہ فن بھی سیکھ لیا تھا اگر بکسورن یا دائی کے آنے میں دیر ہوتی تو یہ آستین چڑھا کر ناف کاٹنے کے لیے بھی تیار ہو جاتیں۔ بچہ کے گھٹی کا نسخہ انھیں زبانی یاد تھا اسی طرح زچہ کے پیٹ کی صفائی کے لیے پلائے جانے والے کاڑھے کی تیاری میں بھی یہ ماہر تھیں زچہ بچہ کی دوا دارو اور ٹوٹکے ٹونے ان سب باتوں میں باجی کو حرف آخر سمجھا جاتا تھا۔ اسی طرح شادی کے موقعہ پر لڑکی کے مانجھے بیٹھنے سے پہلے ہی باجی کو بلا لیا جاتا تھا۔ اس زمانے

میں لڑکی آج کل کی طرح شادی کا سے ایک دن پہلے تک جہیز
کی تیاری اور خرید و فروخت میں نہیں لگی رہتی تھی بلکہ وہ کم
سے کم دو ہفتے پہلے گھر کے ڈیرے میں مانجھے بٹھا دی جاتی تھی
اور وہیں اس کے کھانے پینے اٹھنے بیٹھنے کا مکمل انتظام کر دیا
جاتا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی ہمجولیاں ہی رہتی تھیں، گھر کی
بڑی بوڑھیاں وہاں جانے سے پرہیز کرتی تھیں کیوں کہ
شرمیلی بنّو اپنے بزرگوں کو دیکھ کر شرم سے پانی پانی ہو جاتی
تھی۔ مانجھے میں لڑکی کے پنڈے پر ملنے کے لیے اٹپن باجی ہی
کے مشورے سے نارنگی کے چھلکے وغیرہ ملا کر بڑے اہتمام سے تیار کیا جاتا
اور اٹپن ملائی کی رسم ادا کی جاتی۔ لڑکی کے مانجھے بیٹھتے ہی عزیزوں
اور دوستوں کے یہاں سے مانجھا آنے کا سلسلہ شروع ہو جاتا
اور آخر تک جاری رہتا ۔ مانجھے کو ٹھکانے سے رکھنے اور
اس کے مناسب طریقے پر لڑکیوں میں تقسیم کرنے کا کام بھی باجی
ہی کے سپرد ہوتا۔ مانجھے میں جو لڑکیاں رہتیں انھیں بھی مانجھے
کے گانے معلوم کرنے کے لیے باجی کی تلاش رہتی۔ ایک انار
صد بیمار والی مثل تھی ہر موقعہ پر باجی ہی کی پکار ہوتی، انھیں
اتنی کہاں فرصت کہ وہ بیٹھ کر گیت گائیں، وہ زبانی گیت کا

ایک آدھ بول بتا دیتیں لیکن لڑکیاں پیچھے پڑ جاتیں میری باجی اللہ آپ شروع کر دیجئے پھر ہم اسی ڈھنگ سے گاتے رہیں گے۔ باجی لڑکیوں کا دل نہ توڑتیں اور ڈھولک لے کر "بنو جھکی جھکی جیو سسرال گلیاں" ایسے مزے میں گاتیں کہ گھر بھر کی عورتیں اکٹھا ہو جائیں اور سب کام ٹھپ ہو جاتا یہ دیکھ کر وہ ڈھولک چھوڑ چھاڑ اٹھ کھڑی ہوتیں۔

باجی بڑی نیک دل تھیں کسی کو تکلیف میں دیکھتیں تو تڑپ جاتیں اسی لیے دن ہو یا رات جب کبھی کوئی باجی کو بلا بھیجتا باجی کبھی انکار نہ کرتیں۔ دن میں تو خیر بلانے کے لیے ڈولی آتی تھی لیکن رات کو یہ خود چادر اوڑھ کر چل کھڑی ہوتیں گھر والے ناک بھوں چڑھاتے طعنے تشنے سے بھی کام لیتے کوئی کہتا "سارے جہاں کا درد انہی کے جگر میں ہے" کوئی کہتا باجی تو فالتو بیگم ہو گئی ہیں کسی کے یہاں شادی ہو، غمی ہو کہیں بچہ پیدا ہو یا کوئی بیمار ہو باجی کا جانا ضروری ہے۔

باجی صرف دوا دارو ہی نہیں جانتی تھیں بلکہ شادی بیاہ کے موقعوں پر پکوان پکانے میں کبھی اپنا جواب نہ رکھتی تھیں۔ ان کے ہاتھ کے پکائے گلگلے تو قصبے بھر میں مشہور تھے۔ بری کے جوڑے لگانا بڑی مہارت

کا کام سمجھا جاتا تھا چنانچہ یہ کام باجی کی مدد کے بغیر کہیں بھی انجام نہ پاتا۔ شادی کے موقعہ پر ہونے والی بھانت بھانت کی رسموں کے بارے میں باجی کی بات سند کی حیثیت رکھتی تھی تیل، بین، خدارات منھ دکھائی، سلام کرائی جوتا چرائی، ڈولار کائی غرض ہر موقعہ پر باجی سے صلاح لینا ضروری سمجھا جاتا تھا اور انہی کی رائے سے نیگ دیا جاتا تھا۔ لڑکی کے ساتھ سسرال جانے کا جب سوال اٹھتا تو لڑکی کی ماں یہی چاہتی کہ کسی طرح باجی جانے کے لیے راضی ہو جائیں کیونکہ باجی ہر معاملے سے خوش اسلوبی کے ساتھ نپٹنے کی پوری صلاحیت رکھتی تھیں۔ ہنس مکھ اور ملنسار ایسی تھیں کہ جہاں جاتیں گھل مل جاتیں اور کوئی الجھن نہ پیدا ہونے دیتیں ساتھ ہی ساتھ جواب دینے سے بھی نہ چوکتیں لیکن اس طرح ہنس کر جواب دیتیں کہ کسی کو کوئی تلخی محسوس نہ ہوتی۔

باجی کو شادی بیاہ میں شریک ہونے کا شوق اس لیے تھا کہ وہ گانے کی بڑی رسیا تھیں، میراثنیں جب کوئی اچھی غزل گاتیں تو یہ جھوم جھوم جاتیں اور دل کھول کر پیسے دیتیں۔ جس محفل میں یہ ہوتیں میراثنوں کی بن آتی۔ ان کی دیکھا دیکھی دوسری خواتین کو بھی دینا پڑتا۔ باجی خود بھی بہت اچھا گا لیتی تھیں۔

ان کی آواز میں بڑا درد تھا جب وہ درد بھری آواز میں گاتیں تو لوگ دل تھام لیتے۔ باجی کا دل چوٹ کھایا ہوا تھا۔ ان کی شادی مرضی کے مطابق نہیں ہوئی تھی وہ جہاں چاہتی تھیں وہاں نہ ہوسکی۔ یہ داغ وہ زندگی بھر دل میں لیے لوگوں کی خدمت کرتی رہیں اور گھر والے انھیں فالتو بیگم کہہ کر ان کا مذاق اڑاتے رہے۔

باجی کی صورت شکل بہت اچھی نہیں تو بری بھی نہ تھی۔ پتلی اونچی نوکدار ناک، لمبی آم کی قاش کی طرح رسیلی آنکھیں سونے جیسا دمکتا سانولا سلونا رنگ اوسط قد، چھریرا لچکیلا جسم چار بچوں کی ماں ہونے کے باوجود کنواری لڑکی معلوم ہوتی تھیں سونے پر سہاگا درد بھری سریلی آواز۔ باجی کی آواز میں یہ درد کہاں سے آیا یہ ایک دکھ بھری کہانی ہے۔ باجی کے گھر والے کوئی غریب نہ تھے اچھے کھاتے پیتے چھوٹے زمیندار تھے۔ باپ پرانے زمانے کے وضع دار آدمی تھے۔ مہمان نوازی کا یہ عالم تھا کہ جب تک ٹرین کا وقت نکل نہ جاتا کھانا نہ کھاتے کہ شاید کوئی مہمان آرہا ہو۔ شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا کہ ان کے دسترخوان پر کوئی مہمان نہ ہوتا اسی لیے قصبے میں بڑی عزت کی نگاہ سے

دیکھے جاتے حالانکہ قصبے میں ان سے بڑے زمیندار تھے۔ ان کے ایک دور کے عزیز قصبے کے سب سے بڑے زمیندار تھے یوں تو ان کے کئی لڑکے تھے لیکن سب سے بڑا لڑکا جاوید سخاوت میاں یعنی باجی کے والد سے بہت مانوس تھا۔ وجہ یہ تھی کہ سخاوت میاں کو شعر و شاعری کا شوق تھا اور جاوید کو بھی بچپن سے شعر و ادب سے لگاؤ تھا اس اس لیے سخاوت میاں کے یہاں اس کا آنا جانا بہت تھا۔ باجی یعنی نجمہ اور جاوید ہم عمر تھے اور ساتھ کے کھیلے تھے، دونوں کے گھر بھی قریب ہی قریب تھے جاوید کے گھر کا لکھوری اینٹ کا بنا ہوا دو منزلہ پھاٹک اس تالاب کے سامنے کھلتا تھا جو دونوں گھروں کے درمیان واقع تھا۔ نجمہ کی تعلیم اگرچہ گھر ہی پر ہوئی تھی لیکن اس کے باذوق والد کے یہاں کتابوں کا بہت اچھا ذخیرہ تھا۔ نجمہ نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا تھا۔

ایک دن دوپہر کے وقت نجمہ اپنے گھر کی اٹریا پر اکیلی لیٹی ہوئی یہ غزل گنگنا رہی تھی ؎

پرسشِ غم سے بھلا چارۂ غم کیا ہوگا

اس تکلف سے تو زخم اور بھی گہرا ہوگا

کر دیئے کس نے یہ گل جاگتی آنکھوں کے چراغ

تیری خوشبوئے بدن کا کوئی جھونکا ہوگا
درد جاگ اٹھا ہے ہے لو دینے لگے بجھے چراغ

دل کے زخموں کو تری یاد نے چھیڑا ہوگا
ابھی وہ یہ غزل پوری بھی نہیں کر پائی تھی کہ انھوں نے سنا کہ
کوئی کہہ رہا ہے۔

دل لرزتا ہے ہوا چیخ رہی ہے جاوید
پھر کسی شاخ سے پتہ کوئی ٹوٹا ہوگا (مضطر)

اور جاوید ٹوٹے ہوئے پتے کی طرح آکر گر پڑا جاوید کو دیکھ کر
نجمہ خوش بھی ہوئی اور گھبرائی بھی اس نے گھبرا کر جاوید سے
پوچھا آپ اس وقت یہاں کیسے آگئے، جاوید نے بتایا کہ نگہت کو یکدم
بخار چڑھ آیا، والدہ نے کہا بخار دیکھ لو مگر معلوم ہوا کہ گھر کا تھرما
میٹر ٹوٹ گیا ہے۔ یہاں تھرمامیٹر لینے آیا تھا کہ تمہاری دلکش آواز سن
کر ادھر کھنچتا چلا آیا نجمہ نے شوخی سے کہا تو یہ کہئے کہ آپ خشک پتے
کی طرح اڑتے ادھر چلے آئے مگر آپ کو معلوم ہونا چاہیئے یہ گھر ہے
جنگل نہیں جاوید نے کہا جنگل نہ ہونے کے باوجود کوئل کوک رہی تھی
نجمہ نے ذرا پیشانی پر بل ڈال کر کہا میں کالی ضرور ہوں لیکن اتنی بھی نہیں
کہ کوئل کہا جائے ابھی دونوں میں یہ مکالمہ ہو ہی رہا تھا کہ نجمہ کے چھوٹے

بھائی بہو نے آکر کہا آپ کو امی بلا رہی ہیں نجمہ جلدی سے نیچے اتر گئی تھوڑی دیر بعد جاوید آیا اور اس نے نکہت کے بخار کا حال بتایا، نجمہ کی امی نے میز پر سے تھرمامیٹر اٹھا کر دے دیا اور کہا تم چلو میں ڈولی منگوا کر ابھی آتی ہوں۔

ادھر نجمہ اور جاوید کی محبت پروان چڑھ رہی تھی ادھر جاوید کے والد چودھری الطاف اپنے بیٹے کے لیے کسی بڑے گھر کی لڑکی لاکر جوار میں اپنی ناک اونچی کرنے کی فکر میں تھے۔ محبت پر مصلحت کو فتح حاصل ہوئی اور جاوید والد کی مخالفت کی جرأت نہ کر سکا کیونکہ چودھری صاحب کا غصہ مشہور تھا۔ وہ عاق بھی کر سکتے تھے۔

جب چودھری الطاف کے پھاٹک پر شادی کی خوشی میں شہنائی بج رہی تھی اس وقت نجمہ اپنی اٹریا پر لیٹی یہ اشعار پڑھ رہی اور رو رہی تھی ؎

کی جفا ایک ستمگر نے وفا کے بدلے
زہر کا جام ملا مجھ کو دوا کے بدلے
جس کے سینے میں دھڑکتا تھا کبھی دل میرا
آخر کار وہی بن گیا قاتل میرا
اپنے وعدوں کا محل اس نے جو ڈھایا ہوگا
کیا مرا پیار اسے یاد نہ آیا ہوگا

نفّو چچی

جی ہاں ! اس کے لیے کیا کہیئے کہ بعض لوگوں کے حصے میں مسکراہٹ آتی ہی نہیں۔ ایسی بات نہیں کہ انھیں حصہ نہ ملا ہو۔ اچھا خاصا ملا لیکن ساتھ ہی ساتھ ایسا دھڑکتا ہوا دل بھی ملا کہ ظالم کبھی چین ہی نہیں لینے دیتا۔ کوئی ذرا سے چیخ کر بول دے، دل ہے کہ بلیوں اچھلنے لگتا ہے رتار والے نے آواز دی کہ نفّو چچی ہاتھ رکھ کر بولیں، اللہ خیر کرے۔ کہیں لڑکی کی بات چلی، اتفاق سے جواب میں دیر ہو گئی۔ انھوں نے فوراً طے کر لیا کہ کسی نے لگائی بجھائی کر دی اور اب یہ بیل حشر تک منڈھے چڑھنے والی نہیں وہ دل کی بری نہیں جو کسی پر بلا وجہ الزام لگا دیں، مگر کیا کیجیے ان کا غم پسند دل کبھی کسی چیز کا روشن پہلو لینا جانتا ہی نہیں لڑکے لڑکیوں کے اسکول سے لوٹنے میں ذرا سی دیر ہوئی۔ کہ یہ بے چین ہو گئیں۔ اب یہ نہ بیٹھ سکتی ہیں اور کوئی کام

کر سکتی ہیں کبھی دروازہ جھانکتی ہیں اور کبھی لپک کر چھجے پر پہنچتی ہیں غرض جب تک لڑکے لڑکیاں آ نہیں جاتیں، یہ ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپا کرتی ہیں بچوں کو صحیح سلامت گھر میں آتے دیکھ بے اختیار ان کی آنکھ سے آنسو ٹپک پڑتے ہیں۔ جیسے بچے موت کے منھ سے نکل آئے ہوں ان کے نزدیک دیر سے آنے کی وجہ سوائے حادثے کے اور کچھ ہو ہی نہیں سکتی۔

گھر میں بجلی لگنے سے پہلے ہی انھیں یہ دغدغہ کھائے جانے لگا کہ نگوڑی بجلی کا کیا ٹھیک کہیں کسی کا الٹا سیدھا ہاتھ پڑ گیا تو جان کے لالے پڑ جائیں گے۔ ان کے اس وہم پر اگر کسی کے منھ سے کوئی بات نکل گئی تو سمجھئے غضب ہی ہو گیا وہ واویلے سے گھر سر پر اٹھا لیں گی اور بجلی سے ہونے والے دردناک حادثوں کا ذکر اس رقت آمیز لہجے میں کرنے لگیں گی کہ سننے والوں کو بھی رونا آجائے دھڑکوں کی ماری اور اندیشوں کی شکار ہماری چچی نے اپنے کسی ناتی پوتے کا ختنہ اپنے علم میں کبھی نہیں ہونے دیا۔ کیا انھیں ارمان نہیں تھا۔ تھا اور بے حد تھا مگر اس دھڑکے سے کہ کہیں کچھ ہو نہ جائے۔ وہ کبھی اس کی ہمت نہ کر سکیں اور جب دادیہال یا نانیہال سے ختنے کے بعد غسل صحت کی نوید آئی تو وہ خوشی ضبط کر سکیں

اور آنسوؤں کی جھڑی بندھ گئی۔

اتفاق سے کچھ ایسے واقعات ہو گئے تھے کہ ان کا دل سہم سا گیا تھا ان کے جوان چہیتے دیور اچھے خاصے بندوق کاندھے پر رکھ کر شکار کو گئے لیکن لوٹے تو دوسروں کے کاندھے پر ... بے چارے نالی چھٹ جانے سے اپنی گولی کا خود شکار ہو گئے ایک بار چچی جان اپنے بھائی کے لڑکے کی بسم اللہ میں بڑے ارمان سے گئیں۔ تو ٹیں تو اس حال میں کہ ان کے منو میاں کی چھنگلیا لہو لہان تھی اور وہ بجلی کے پنکھے کو ہزاروں صلواتیں سنا رہی تھیں اسی لیے تو انھوں نے ٹیبل فین گھر میں آنے نہ دیا۔ شادی بیاہ میں اگر زبردستی کوئی لے آتا تو وہ ان کے لیے جان کا جنجال بن جاتا کسی بچے کو ادھر جاتے دیکھتیں تو گھر سر پر اٹھالیتیں۔ بچوں کی پٹائی کے ساتھ ساتھ لانے والوں کی کوئی گت اٹھا نہ رکھتیں۔ نوج بال بچے والے گھروں میں جان جوکھم چیزیں لانے کی کیا گاڑھی پڑی ہے۔ ان کے بغیر کون سا کام رک جاتا ہے اور جب تک انھیں اٹھوا کر کسی بڑی اونچی میز پر نہ رکھوا دیتیں کسی کل چین نہ لیتیں۔

اسی خیال سے ہمارے چچا جان نے چھت کے پنکھے اس وقت لگوائے جب چچی اپنے بھتیجے کی شور بہ چٹائی میں میکے گئی ہوئی تھیں وہاں سے

لوٹیں تو گھر کا یہ حال دیکھا سر پکڑ کر بیٹھ گئیں ۔ گرمیوں کا زمانہ تھا جب پنکھے کی ہوا لگی اور پسینہ خشک ہوا تو بولیں " خیر اچھا کیا کہ یہ میز والے موذی پنکھے نہیں لائے " ۔ ورنہ ہر وقت بچوں کی جان جوکھم رہتی مگر اس کے باوجود کبھی کسی بچے کو نہ تو پنکھے کے نیچے بیٹھنے دیا نہ لیٹنے اور خود بھی ہمیشہ دس قدم دور ہی رہیں ۔ جہاں تک بجلی کے آن آف کرنے کا سوال ہے ۔ آپ کے نزدیک وہ چاہے جتنا بے خطر ہو لیکن ہماری چچی جان سوئچ پر ہاتھ لگانا جان پر کھیلنے کے برابر سمجھتی ہیں لیکن زمانہ بھی بڑا ظالم ہے ۔ وہ نہ تو کسی کے دھڑکوں اور اندیشوں کی پروا کرتا ہے اور نہ پرانی ریت سے چمٹے ہوئے ذہنوں کی چیخ پکار کا ۔ ... بیچاری ہماری چچی ابھی موذی پنکھوں کا رونا رو رہی تھیں کہ ان کی صاحبزادی بجلی کی استری بھی لے آئیں ۔ وہ دیکھتے ہی برس پڑیں " آخر اس کی کیا ضرورت تھی ، اچھی خاصی پیتل والی استری رکھی تھی کہ ایک مرتبہ جلا دو تو کپڑے پر شکن کا نام تک نہ رہے نگوڑی یہ چھٹانک بھر کی استری کیا کام دے گی پھر کسی کا ادھر ادھر ہاتھ لگ گیا تو جان الگ خطرے میں پڑ جائے گی " ۔ کچھ دنوں تک تو یہ استری جوجو کی طرح الگ رکھی رہی خاص ہی خاص لوگ خاص موقعوں پر اسے استعمال کرتے مگر رفتہ رفتہ چچی کی چہیتی گھنٹوں میں گرم ہونے

والی پتیل کی استری نظروں سے گرتی گئی اور بجلی کی پھر تیلی استری خطرناک ہونے کے باوجود دلوں میں جگہ کرتی گئی کیونکہ نیا ہندوستان بیل گاڑی کی سست رفتاری سے اکتا کر سائیکل موٹر کا مزا لیتا ہوا۔ ہوائی جہاز سے پینگیں بڑھا کر راکٹ کی طرف لپک رہا تھا۔

لیکن جب تک کوئی استری کرتا رہتا ہماری چچی جان کی جان پتے پر رہتی اور وہ سینے پر صبر کی سل رکھے، سہمی ہوئی، اس کی طرف ٹک ٹکی باندھے دیکھتی رہتیں۔ تھوڑے دنوں کے بعد ان کی آنکھیں بھی عادی ہوگئیں اور دل قابو میں آگیا۔ لیکن انھوں نے بھول کر بھی اسے ہاتھ نہ لگایا۔

جاڑے آئے، بدلی چھائی۔ ہوا ڈولتے ہی، سردی چمک اٹھی اور دانت کڑکڑانے لگے۔ چچی جان لاکھ اوڑھیں لپٹیں، لیکن ان کا جاڑا بغیر تاپے نہیں جاتا اور وہ اس کا چوکس انتظام بھی رکھتی ہیں کیا مجال کہ ان کی انگیٹھی کے کوئلوں پر راکھ جمنے پائے۔ وہ ہر وقت دہکتے ہی رہتے ہیں۔ چچی جان تاپتی جاتی ہیں۔ پان کھاتی جاتی ہیں اور باتیں کرتی جاتی ہیں۔ جاڑوں میں ان کا یہی دل پسند مشغلہ ہے۔

مگر ایک دن جب ان کے بڑے صاحبزادے نے اپنے کمرے میں

چٹکے سے ہیٹر روشن کیا تو چھوٹے بڑے سب پروانوں کی طرح اس کے گرد جمع ہو گئے اور چچی جان کے پاس ان کے میکے کی نوکرانی خوش قدم کے سوا کوئی کوئلے کی انگیٹھی میں تاپنے کے لیے نہ رہا۔ انھیں جو سن گن ملی تو انھوں نے سر پیٹ لیا، ایک دن سب اسی میں بھسم ہو کر رہ جاؤ گے۔ باری تعالیٰ! تو نے مجھے اس سے پہلے کیوں نہ اٹھا لیا جو یہ سب کچھ دیکھنا پڑ رہا ہے"۔ وہ چیخ پیٹ کر خاموش ہو گئیں۔ ہیٹر چلتا رہا پہلے باہر ہی کمرے میں رکھا رہا پھر اندر آگیا۔ مگر چچی کبھی اس کے قریب سے بھی نہ گزریں اور صبر کی سل سینے پر رکھ کر کسی طرح سردی کاٹ دی۔

اللہ اللہ کر کے جاڑے کے ساتھ ہیٹر کا دھڑکا ختم ہوا تو ان کی چھوٹی بہن کی لڑکی شنو نے ایک نیا شوشہ چھوڑ دیا۔ وہ جو دہلی سے آئیں تو اپنے ساتھ گیس کا چولہا بھی لیتی آئیں اور بولیں، خلیا، اب میں اسے یہیں چھوڑے جاؤں گی۔ چولھے اور انگیٹھی کے دھوئیں نے آپ کی آنکھوں پر برا اثر ڈالا ہے اس کا کھٹ راگ ختم کیجئے دھوئیں میں بلاوجہ آنکھیں پھوڑنے سے کیا فائدہ۔ لکڑی پر گیس سے کم خرچ نہیں ہوتا بلکہ زیادہ ہی بیٹھتا ہے۔ پھر جب گھنٹوں چولھا پھونکو تب جا کر پتیلی گرم ہو۔ گیس کا چولھا دیا سلائی دکھائی بھک سے جل اٹھا۔ نہ دھواں نہ دھار منٹوں میں کھانا تیار پھر نہ کھانا جلنے کا ڈر! نہ پتیلی مانجھنے کی زحمت۔

نہ بابا۔ مجھے معاف رکھو۔ گیس چولہا تم ہی لوگوں کو مبارک ہو۔ بٹیا تم نہیں جانتیں۔ جلدی کا کام شیطان کا ہوتا ہے۔ جلدی کام کرنے میں اپنی اور بچوں کی جان خطرے میں نہیں ڈالتی۔ لاکھ اڑنے والی چیز کا کیا بھروسہ۔ نکل ہی پڑی تو جان کے لالے ہو جائیں گے۔" ابھی چچی جان گیس چولہے پر لعن طعن کر رہی تھیں کہ لڑکی لڑکیاں نے چٹ پٹ گیس چولہے پر پریشر کوکر رکھ کر آنکھ جھپکاتے کھانا بھی تیار کر دیا۔ خلاف معمول جب چچی جان نے باورچی خانے میں سناٹا دیکھا بگڑ کر بولیں۔ "کیا آج کھانا نہیں پکے گا۔ بہن کے آنے کی خوشی میں کیا بھوک پیاس مٹ گئی۔

لڑکیوں میں کھسر پھسر ہونے لگی۔ ایک نے ہمت کر کے کہا۔" کھانا کب کا تیار رکھا ہے بھوک لگی ہو تو دستر خوان بچھایا جائے۔

"مجھے یہ بتاؤ نہ چولھا جلا، نہ پتیلی چڑھی کیا کھانا جادو کے زور سے پک گیا۔؟ خالہ جان جادو کے زور سے نہیں گیس کے زور سے پک گیا۔

کوئی اور کہتا تو چچی جان یقین نہ کرتیں۔ اور صلواتیں سنانا شروع کر دیتیں۔ مگر ان کی بھتیجی نے کہا تھا۔ اس لیے خاموش ہو گئیں اور یقین بھی کر لیا۔ دوسرے وقت بھی اسی طرح جادو کے زور سے کھٹ سے کھانا پک گیا۔

جب تک گیس کا چولہا جلتا رہتا، چچی جان انگاروں پر لوٹتی رہتیں۔ ایک کل چین نہ ملتا۔ جیسے ہی گیس کھولی جاتی ویسے ہی بے اختیار ان کے منہ سے نکل جاتا "اللہ تو ہی حافظ ہے" بھک سے آواز سنتے ہی وہ آنکھیں بند کر لیتیں۔ جب تک کھانا پکتا رہتا وہ سہمی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہتیں اور دل ہی دل میں دعائیں مانگتی رہتیں اللہ، جلد اس سے نجات دلا دے مگر ہوا یہ کہ شنو کے دہلی جانے کے بعد بھی چولہا جلتا رہا اور چچی جان کا دل دھڑکتا رہا فرق صرف یہ ہوا کہ اب انھوں نے اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی دعائیں مانگنی بند کر دیں۔ مگر دل سے مجبور تھیں وہ تو دھڑکتا رہا۔ شاید ذہن نے بدلتے ہوئے حالات سے صلح کر لی۔



دادامیاں

اللہ بخشے ہمارے رشتے کے ایک دادامیاں تھے، دیہات کے رہنے والے، پرانے زمانے کے لوگ، بات کا اتنا پاس کہ جان جائے پر بات نہ جائے وضعداری تو ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ جیسے خود صاف دل اور محبت کرنے والے تھے ویسے ہی ان کے دوست اور ساتھی بھی تھے پرانے زمانے کے لوگوں کے دوست کم لیکن ان کی دوستی پکی ہوتی تھی۔ پڑوس میں ٹھاکروں کے گھر تھے، ایک ٹھاکر صاحب سے ان کی دانت کاٹی روٹی والی دوستی تھی، بچپن کے ساتھی اور لنگوٹیا یار تھے بچپنے میں ساتھ کھیلے تھے اور جوانی میں ایک ہی اکھاڑے میں زور آزمائی کی تھی، پھر جب بڑھاپا آیا تو دونوں نے چوپال میں ساتھ بیٹھ کر بیتے دنوں کی بات تازہ کی تھی۔

ٹھاکر صاحب کی صحت تو اچھی تھی لیکن لڑکے کا غم مارے ڈال رہا

بڑی ٹھکرائن جوانی ہی میں سورگ باش ہوگئی تھی اور کوئی نشانی بھی نہ چھوڑی تھی۔ بڑی ٹھکرائن کے غم کے باوجود کنبے کا نام زندہ رکھنے اور گھر کا چراغ جلائے رکھنے کی غرض سے ٹھاکر صاحب نے دوسری شادی کی اور بھگوان کی دیا سے جلد ہی چھوٹی ٹھکرائن کی گود بھر بھی گئی اور لڑکے کو جنم دے کر انھوں نے ٹھاکر صاحب کی دلی خواہش پوری کر دی۔

منتو ان مرادوں کا اکلوتا لڑکا ماں کی آنکھوں کا تارا باپ کا دلارا تھا۔ باپ لاڈ دلار کے باوجود لڑکے پر کڑی نگاہ رکھتے مگر لڑکا ان کی نگاہوں سے بچ کر خوب شرارتیں کرتا محلے پڑوس کے لوگ ٹھاکر صاحب کے لحاظ سے کچھ نہ کہتے مگر سن گن تو ٹھاکر صاحب کے کانوں تک پہنچ ہی جاتی جس سے انھیں بڑا دکھ ہوتا۔ وہ دمے کے پرانے مریض تھے لڑکے کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر ان کی صحت تیزی سے گرنے لگی۔ ایک دن تو لگاتار ایسی سانس پھولی کہ جان کے لالے پڑ گئے۔

دادا میاں بوڑھاپے کے باوجود ابھی کافی ٹانٹھے تھے ٹھاکر صاحب پر جب دمے کا دورہ پڑا تو انھوں نے ساری رات سرہانے بیٹھ کر بتا دی۔ سویرے ذرا آنکھ جھپک گئی مگر ٹھاکر صاحب

کی آواز سن کر فوراً چونک پڑے اور خیریت پوچھی۔ ٹھاکر صاحب نے سوکھے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا دوست یہ امانت تمہارے سپرد ہے اور لرزتے ہوئے ہاتھوں سے لڑکے کا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے دیا اور آنکھیں بند کر کے ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئے۔

دادا میاں اس موقعہ پر لڑکے کا ہاتھ نہ پکڑتے تو کیا کرتے ٹھاکر صاحب تو اپنا بار ہلکا کر کے سدھار گئے لیکن دادا میاں کی جان جنجال میں پڑ گئی۔ اپنے ہی بال بچوں کی فکر کیا کم تھی دوست کے لڑکے کی دیکھ بھال کا بار اور سر پہ لد گیا۔

لڑکا بھی کسی کا ٹھاکر کا لڑکا جو ناک پر مکھی تک بیٹھنے نہ دیتا اور اگر مکھی ناک میں چلی جاتی تو خود بھاڑ میں گھس جانے پر آمادہ ہو تا۔ جب تک چھوٹا رہا گاؤں کے لڑکوں سے لڑتا رہا بڑا ہوا تو جوار کے بڑے بڑے لٹھ بازوں سے مورچہ لینے لگا۔ بد دماغی کا یہ حال تھا کہ اس کے دروازے کے سامنے سے اگر کوئی گھوڑے پر سوار ہو کر نکلتا تو اس پر بھوت سوار ہو جاتا اور تاؤ میں آکر گھوڑے کی ٹانگیں توڑنے کے علاوہ سوار کا سر پھوڑنے پر آمادہ ہو جاتا۔ اس اکھڑ پن کا نتیجہ ظاہر تھا۔ ایک مرتبہ کسی بگڑے

دل ٹھاکر سے مڈبھیڑ ہوگئی سرپھٹول ہوئی پھر دونوں طرف سے گھر یاؤں بلائے گئے، خوب جم کر لاٹھی چلی دو چار ادھر اور دو چار ادھر زخمی ہوئے جن میں لوڑھے دادا میاں اور ان کا جوان نوکر بھی تھا۔

دادا میاں کی کسی سے لڑائی نہ تھی، جوار کے لوگ انھیں اپنا بزرگ مانتے تھے لوگوں نے لاکھ سمجھایا، اونچ نیچ دکھائی لڑکے کی شورہ پشتی اور اجڈپن کے قصے بتائے اور کہا کہ آپ اس کا ساتھ نہ دیجئے ورنہ اپنے ساتھ یہ آپ کو بھی لے ڈوبے گا لیکن دادا میاں سب جاننے اور سمجھنے کے باوجود لڑکے کا ہاتھ پکڑنے کے بعد مرتے دم تک اس کا ہاتھ نہ چھوڑ پائے۔ جب کبھی کہنے سننے سے ہاتھ سمیٹ لینے کا خیال آتا تو دوست کی ڈوبتی ہوئی نگاہیں یہ کہتی معلوم ہوتیں کہ کچھ سمجھ ہی کر لڑکے کا ہاتھ پکڑایا تھا پھر ان کے ہاتھ لوہے کی طرح سخت ہو جاتے اور کسی کے چھڑانے سے بھی لڑکے کا ہاتھ نہ چھوڑتے۔

لاٹھی لٹھ لینا اور سرپھٹول کر لینا تو آسان ہوتا ہے لیکن اس کے بعد آنے والی مصیبتوں کا سامنا کرنا ٹیڑھی کھیر ہوتا ہے۔ رپورٹ ہوتے ہی پولس موت کی گھر گھیر لیتی ہے اور پھر اس سے پیچھا چھڑانا

مشکل ہو جاتا ہے۔

فوجداری کے بعد دونوں طرف سے دوڑ دھوپ شروع ہوگئی۔ زخمیوں کا ڈاکٹری معائنہ کرانا، وکیل کے گھر کے چکر لگانا اور پیسے کو پانی کی طرح بہانا آسان کام نہ تھا۔ مقدمہ کی پیروی میں جوانوں کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں تو پینسٹھ برس کے دادا میاں کا جو حال ہوا ہوگا وہ ظاہر ہے لیکن ان کے چہرے پر شکن تک نہ آئی ان کا دل کڑھتا رہا لیکن منھ کی مسکراہٹ کبھی نہ گئی۔ جب کوئی سمجھاتا تو کہتے کہ اوکھلی میں سر دے کر چوٹوں کا کیا ڈر؟ جب لڑکے کا ہاتھ پکڑا تھا تو کیا اس کے لچھن جانتے نہ تھے۔ اب پیچھے ہٹنے کا کوئی سوال نہیں۔

پولس نے دونوں طرف کے لوگوں کا چالان کر دیا۔ دادا میاں کے ساتھ ان کے بھتیجے بھی گیہوں کے ساتھ گھن کی طرح پس گئے۔ ٹھاکر صاحب کے لڑکے تیغ بہادر سنگھ اور ان کے نوکروں کے علاوہ دادا میاں ان کے بھتیجے اور ملازمین سب گرفتار ہو کر حوالات میں پہونچا دیئے گئے۔ اب گھر میں ضمانت کا انتظام کرنے والا بھی کوئی نہ رہا۔ سب کے ہاتھ پاؤں پھول گئے لیکن ٹھکرائن کی پیشانی پر بل نہ آیا اور انھوں نے قسم کھائی کہ جب تک بڑے بھیا، یعنی دادا میاں حوالات میں رہیں گے وہ

چارپائی پر نہ لیٹیں گی ۔ وہ فوراً رتھ پر بیٹھ کر اپنے میکے پہونچیں اور دو دو ضمانت دار سب کے لیے پکے کر کے لے آئیں ۔ لیکن ابھی ضمانت کی کاروائی پوری نہیں ہوئی تھی کہ وہ آدمی جو تیغ بہادر کی لاٹھی سے زخمی ہوا تھا چل بسا عدالت نے دادا میاں کی ضمانت تو منظور کی لی لیکن تیغ بہادر کی ضمانت نہیں منظور کی جب دادا میاں حوالات سے نکالے جانے لگے تو انھوں نے باہر جانے سے انکار کر دیا ۔ وہ خاموش تھے لیکن ان کی ڈبڈبائی آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ ہیں نے جس کا ہاتھ پکڑا ہے اسے اکیلا چھوڑ کر نہیں جا سکتا جب لڑکے کی ضمانت اوپر کی عدالت سے منظور ہو جائے گی تب ہم دونوں ساتھ گھر آئیں گے ۔ وہ اکھڑ لڑکا جو بڑے بڑے اونچی مونچھ والوں کے سامنے سر جھکانا کیا آنکھیں نیچی کرنا بھی نہیں جانتا تھا وہ آنکھوں میں آنسو بھرے دادا میاں کے پاؤں پکڑے ان سے حوالات کے باہر جانے کی خوشامد کر رہا تھا لیکن دادا میاں پہاڑ کی طرح اپنی جگہ پر اٹل تھے، وہ اپنے فیصلے سے ذرا بھی ٹس سے مس نہ ہوئے ۔ دوسرے لوگ مجبور ہو کر دادا میاں کو تیغ بہادر کے ساتھ حوالات میں چھوڑ کر چلے گئے

سب لوگوں کے چلے جانے کے بعد جب تنہائی ہوئی تو تیغ بہادر

دادا میاں کے پاس آیا اور سسکیاں بھر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اس نے کہا کہ یہ بے عزتی یہ تکلیف اور یہ پریشانی میرے برے کرتوت سے آپ کو اٹھانی پڑی، میں لجا سے زمین میں گڑا جا رہا ہوں بھگوان کے لیے آپ مجھے معاف کر دیجئے۔

دادا میاں نے محبت سے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا اور کہا بیٹا یہ سب تکلیفیں میں نے اپنی خوشی سے برداشت کی ہیں تم نے تو کبھی مدد کے لیے پکارا بھی نہیں، اس میں تمہارا کیا دوش وہ یہ سن کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور کہا نہیں بڑے بابا میں پاپی ہوں میں نے نہ کبھی پتاجی کی بات مانی اور نہ آپ کی بات پتاجی کڑھ کڑھ کر مر گئے مگر اب میں آپ کی ہتیا کا پاپ نہ لوں گا آپ میری خطا معاف کر دیجئے اب آپ جو کہیں گے وہی کروں گا۔

صبح جب دادا میاں کی آنکھ کھلی تو سورج حوالات کی سلاخوں سے جھانک کر اس کایا پلٹ کو اچنبھے سے دیکھ رہا تھا جس نے کمان کی طرح ٹیڑھے لڑکے کو تیر کی طرح سیدھا کر کے دادا میاں کے ترکش میں رکھ دیا تھا کہ وہ جس طرح چاہیں استعمال کریں۔

کچھ دنوں بعد ہائی کورٹ سے تیغ بہادر کی ضمانت منظور ہوگئی اور جب نوجوان تیغ بہادر بوڑھے دادا میاں کے ساتھ سر جھکائے حوالات سے نکل کر ان کی حویلی میں پہونچا تو جوار کے سب ٹھاکر برہمن اور دوسرے با اثر لوگ دادا میاں کے انتظار میں بیٹھے تھے انھوں نے دادا میاں کو الگ لے جاکر بتایا کہ ان لوگوں نے فوجداری میں مارے جانے والے آدمی کی بیوہ کو راضی کر لیا ہے آپ جو کہئے گا۔ وہ ویسا ہی کرے گی۔ دادا میاں نے بیوہ کو بلوا کر آٹھ بیگھے اپنی زمین اس کی گذر بسر کے لیے دیدی اور تیغ بہادر سے کہا کہ اس کے یتیم بچے کے سر پر ہاتھ رکھو۔ آج سے یہ تمہارا چھوٹا بھائی ہے۔ دادا میاں مر چکے ہیں لیکن تیغ بہادر اس لڑکے کو سگے بھائی کی طرح مانتا ہے لڑکے کی ماں اور جوار کے سبھی لوگ تیغ بہادر میں آنے والی تبدیلی سے خوش ہیں اور دادا میاں کو دعائیں دے رہے ہیں۔



گیا دین دادا

گیا دین دادا ہمارے گھر کے تمام بچوں کے لیے ہر مرض کی دوا درود شریف کی حیثیت رکھتے تھے جو بھی کام ہوتا وہ انھیں کے پاس جاتے۔ ساون آتے ہی بچے پھاٹک کے سامنے والی نیم میں جھولا ڈالنے کے لیے گیا دین دادا کے پیچھے پڑ جاتے وہ انھیں آتا دیکھ کر پھاٹک میں داخل ہونے سے پہلے ہی دادا! جھولا، دادا جھولا، کی رٹ لگا دیتے کوئی ان کی دھوتی کوئی کرتا اور کوئی پگڑی کھینچ کر جھولے کے لیے گاؤں سے پیا ورکا برارا بنوانے کے واسطے خوشامد کرنے لگتا۔

گیا دین دادا کسی کو گود میں کسی کو بغل میں اور کسی کو کاندھے پر بیٹھا کر پیار سے سمجھانے لگتے کہ اس سال برارا بنانے کی جس اساجی کی اوسری (باری) تھی وہ بیمار ہے۔ تنک سنبھل جائے تو برارا بنوائے دیب ابھی سے کاہے جان کھائے ہو ابھی تو پوری برکھا پڑی ہے اور جب بچے گیا دین دادا کی جان نہ چھوڑتے تو وہ کنویں پر پڑی

ادوہن (پانی بھرنے کی رسی) اٹھا کر نیم کے کسی نیچے جنگھے (موٹی شاخ) میں عارضی طور پر بغیر پیڑے کا جھولا ڈال دیتے اور اس طرح بچوں کی بلا اپنے سر سے ٹال دیتے۔

گیان دادا ہمارے گھر کے بہت پرانے ملازم تھے چکلہ دار محمد روشن کے خاندان سے گیا دین دادا کے گھرانے کا شاہی زمانے سے تعلق تھا۔ اس تعلق کو گیا دین دادا ابھی اپنے پوروجوں کی پوتر دھروہر کی طرح سینے سے لگائے ہوئے تھے اور انھوں نے کبھی اس خاندان کے نام کو نیچا نہ ہونے دیا اور جب کبھی کوئی ایسا آڑا وقت آیا تو اپنی جان کی بازی لگا دی۔

تعلقہ تو کب کا کر کب کا ختم ہو چکا تھا لیکن چھ گاؤں میں راجہ کے مقابلہ میں تہائی حصہ اب بھی باقی تھا۔ انھیں چھ گاؤں سے ایک گاؤں فتحاپور میں گیا دین دادا کا خاندان معلوم نہیں کب سے رہتا چلا آ رہا تھا۔ اس گاؤں میں اسی فیصدی آبادی شورہ پشت پاسیوں کی تھی گیا دین دادا کا تعلق اس جوار کے نامی ڈاکو پرتیم پاسی کے خاندان سے تھا جس کے نام سے بڑے بڑے زمینداروں کی سٹی گم ہوتی تھی۔ گیا دین دادا ڈاکو تو نہ تھے لیکن بڑے گروہ بند اور لٹھیت (لاٹھی باز) تھے ان کی ایک ہانک

پر سینکڑوں پاسی پل بھر میں اکٹھا ہو سکتا تھا ہم نے خود تو گیا دین دادا کی لٹھیتی دیکھی نہ تھی لیکن جب وہ مزے میں آکر اپنی جوانی کی فوجداری کے قصے سناتے تو ہمارے رونگٹے کھڑے ہو جاتے وہ بتاتے کہ ایک مرتبہ جب ان کے پٹیتوں نے دشمنوں نے (مخالفوں نے) بڑا گھیراؤ کر کے انھیں راستے میں گھیر لیا تو یہ سر میں مُرسیٹھا (انگوچھا) باندھ اپنے گولے دار لاٹھی لے کر پانے کے ہاتھ گھمانے لگے جس سے آدمیوں کی بھیڑ کائی کی طرح چھٹ گئی اور یہ صاف بچ کر نکل آئے

اگر کھنڈر دیکھ کر عمارت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے تو ہم گیا دین دادا کے بڑھاپے سے ان کی جوانی کا اندازہ کر سکتے ہیں وہ ساٹھ برس کی عمر میں بھی ساٹھے پاٹھے تھے اور لمبے ہونے کے باوجود ان کی کمر کمان کی طرح جھکی نہیں بلکہ تیر کی مانند سیدھی تھی وہ اب بھی اپنے قد سے ایک ہاتھ اونچی مہندی اور تیل لگی گولے دار لاٹھی کندھے پر رکھ کر جوانوں کی طرح مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے چلتے تھے لمبے قد کے ساتھ ان کا جسم گداز تھا لیکن بڑھاپے کی وجہ سے ان کی گردن کی کھال لٹک آگی تھی اور سیاہی مائل چہرے پر جھریاں کنمنانے لگی تھیں ان کا ماتھا چوڑا، آنکھ بڑی ناک لمبی لیکن قدرے موٹی تھی ہونٹ نہ پتلے نہ موٹے ان کا بڑا سا منھ تبسیمی

سے بالکل خالی تھا۔ لیکن بڑی گھنی سفید مونچھیں ان کے پوپلے پن کو چھپائے ہوئے تھیں ان کی چندیا صاف نہ تھی بلکہ گھنے بال تھے مگر وہ اتنی پابندی سے پگڑی باندھتے تھے کہ انھیں ننگے سر دیکھنے کو آنکھیں ترس گئیں وہ بڑھاپے میں بھی کپڑے لتے کا بڑا خیال رکھتے تھے مارکین کا لمبی آستین والا کرتا کسی ہوئی اونچی دھوتی۔ دہی پیا اور تیل میں ڈوبا چرمر کرتا ہوا جوتا پہن کر جب وہ لمبی لاٹھی کاندھے پر رکھے ہوئے نکلتے تو بہتوں کی جوانی ان کے بڑھاپے پر رشک کرنے لگتی۔

گیادین دادا اپنے گاؤں سے دل میں ایک مرتبہ لباون پور میں عزیز میاں کے مکان بارہ دری کی ڈیوڑھی پر حاضری دینے ضرور آتے ہم لوگ ان کی آمد کا بے چینی سے انتظار کرتے کیونکہ وہ کبھی خالی ہاتھ نہ آتے ان کے انگوچھے میں بچوں کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور بندھا ہوتا کبھی گڑ کی بھیلی، کبھی سنگھاڑے کی گودی، کبھی بوٹ، کبھی مٹر کی پھلی غرض فصل کی کوئی نہ کوئی چیز ضرور لاتے۔

ایک دن انگوچھے میں سنگھاڑے باندھے اور لاٹھی کاندھے پر رکھے لمبے لمبے ڈگ مارتے چلے آرہے تھے، کہ انھوں نے سنا کوئی انھیں پکار رہا ہے وہ فوراً ادھر مڑ گئے انھوں نے دیکھا کہ عزیز میاں کا ایک اسامی رو رو کر کہہ رہا ہے کہ "راجہ کے سپاہی تلاؤ

(تالاب) سے بیڑی ناہی لگا دے دیت ہیں، کہت ہیں پہلے راجا کے ہتھول کیسر بیڑی لگی پھر میاں کے اسامی کھیت سینچ ہیں۔" یہ سننا تھا کہ گیا دین دادا کے بدن میں آگ لگ گئی اور انھوں نے راجہ کے سپاہیوں سے للکار کر کہا " کا جان کے بیدھے ہو۔ جبلے گیا دین جیت ہیں یو نہ ہوئے دے ہیں" اور آؤ دیکھا نہ تاؤ ایک کر ایک سپاہی پر لاٹھی چلا دی ابھی یہ گھومنے نہ پائے تھے کہ دوسرے سپاہی نے بیٹھ کر ان کے گھٹنے پر لاٹھی مار دی یہ لڑکھڑائے لیکن گرتے گرتے اس کے پیٹ میں لاٹھی کا ہورا اتنے زور سے مارا کہ وہ پیٹ پکڑ کر بیٹھ گیا اب پہلا سپاہی سنبھل چکا تھا اس نے جھپٹ کر گیا دین دادا پر وار کیا لیکن اس کی لاٹھی آم کی ایک شاخ میں الجھ کر رہ گئی وہ دوسرا وار کرنے ہی والا تھا کہ اس نے دیکھا کہ گیا دین دادا کے گاؤں سے لوگ گالیاں دیتے لاٹھیاں لیے دوڑے چلے آرہے ہیں اس نے لاٹھی چلائی تو لیکن گھبراہٹ میں وار اوچھا پڑا پھر بھی گیا دین دادا کی پگڑی خون سے تر بتر ہو گئی۔ انھوں نے خون پونچھتے ہوئے عزیز میاں کے اسامی سے کہا بیڑی لگا راجہ کے ہرے سپاہی بھاگ گئے عزیز میاں کو جیسے ہی خبر ہوئی وہ گیا دین دادا کو گھر لے آئے اور جب تک وہ بالکل اچھے نہ ہو گئے

انھیں جانے نہ دیا۔ اور آم کا ایک پرانا باغ ان کے نام لکھ دیا

گیا دین دادا کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اگر کوئی ان سے قرض مانگتا تو وہ اسے کبھی مایوس نہ کرتے اس میں ایک جذبہ تو ہمدردی کا تھا اور دوسرا جذبہ شان کا تھا گیا دین دادا کوئی مالدار آدمی نہ تھے مگر رہتے ٹھاٹھ باٹھ سے تھے گھر کچا تھا لیکن باہر بیٹھکا انھوں نے کچی اینٹیں پتھوا کر بنوایا تھا اور کودوں کی بھوسی ملوا کر کنّی سے مٹی لگوائی تھی۔ بیٹھکے میں ایک بڑا تخت، سینٹھے کے بنے دو مونڈھے، لکڑی کی ایک پتالی اور دو چار مونج کے بنڈرے پڑے رہتے، نیالی میں ہر وقت آگ دبی رہتی اور چلم کا دور چلتا رہتا

سواری اور شان کے لیے ایک ٹانگھن نیم کے نیچے بندھا ہنہنایا کرتا انھیں شکار کا کبھی شوق تھا اس لیے ایک تازی کتا کبھی پال رکھا تھا جو چوگڑے یعنی خرگوش کا شکار کیا کرتا تھا۔ ٹھاٹھ باٹھ کے باوجود گیا دین دادا کے پاس اتنا روپیہ نہ تھا کہ وہ قرض بانٹتے لیکن اپنی ساکھ برقرار رکھنے کے لیے وہ ہماری دادی اماں سے قرض لے کر لوگوں کو قرض دیا کرتے تھے اور شان میں مگن رہتے تھے۔

گیا دین دادا کے کوئی لڑکا نہ تھا تین لڑکیاں تھیں بڑی لڑکی کا بیاہ گھر داماد و کیا تھا۔ داماد اور اس کے بچے انہی کے ساتھ رہتے تھے سب

سے چھوٹی لڑکی سندر یا ہماری ہم عمر تھی اور جب ہم گیا دین دادا کے ساتھ ان کے گھوڑے پر بیٹھ کر جاتے تو وہ بہت خوش ہو جاتی اور ہم دونوں گیا دین دادا کے باغ میں گھنٹوں کھیلا کرتے اور امرود اور بیر توڑ کر کھایا کرتے۔

گیا دین دادا کو ہمارے والد عزیز میاں نے جو باغ دیا تھا اس کی وہ بڑی دیکھ ریکھ کرتے کیا مجال کوئی ایک پتہ کبھی توڑے انھوں نے کھائیں پر بیادر، چار کونوں پر چاؤ بانس اور کنارے کنارے امرود اور بیر کے پیڑ لگائے تھے اور بیچ میں آم کے نئے درخت لگاکر پرانے باغ کو نیا جنم دیا تھا۔

آخر وقت میں گیا دین دادا کو دمے کی شکایت ہوگئی تھی۔ عزیز میاں نے ان کا بڑا علاج کیا لیکن دمہ دم کے ساتھ ہے جان لے کر ہی دم لیتا ہے جب ان کی زیادہ حالت خراب ہوئی تو ہمارا پورا گھر انھیں دیکھنے گیا جس میں دادی اماں بھی شامل تھیں گیا دین دادا نے چپکے سے دادی اماں سے کوئی بات کہی اور دادی اماں آنکھوں میں آنسو لیے رندھی ہوئی آواز میں بولیں، میں نے معاف کیا میرے اللہ نے معاف کیا، غالباً گیا دین دادا نے قرض معاف کرایا تھا۔

دوسرے دن یہ خبر آئی کہ گیا دین دادا چل بسے۔ ان کی وصیت کے مطابق عزیز میاں کے دیئے ہوئے باغ میں ان کی سمادھی بنائی گئی۔ اب ان کی جگہ ان کا داماد بدلو کام کرنے لگا۔

ایک دن ہم اس کے ساتھ گیا دین دادا کے گھر گئے تو سندریا ہم کو دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ہماری آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے بعد کو ہم دونوں باغ گئے کھیلنے نہیں گیا دین دادا سے ملنے گیا دین دادا نے باغ میں روش بنوا کر اس کے کنارے بیلا اور کونے پر تلسی لگوائی تھی کالے بادل گھر کر آ گئے تھے اور بوندا باندی شروع ہو گئی تھی ہم دونوں گیا دین دادا کی سمادھی کے پاس خاموش کھڑے تھے میں کچھ سوچ کر بیلے کا ایک پودا دوسرے کونے پر لگا دیا یہ دیکھ کر سندریا نے تلسی کا پودا دوسرے کونے پر لگا دیا۔

زمینداری ختم ہو گئی ہم لوگ شہر چلے آئے، سندریا بیاہ کر سسرال چلی گئی لیکن بیلا اور تلسی بڑھ کر اب بھی گیا دین دادا کو اپنی آغوش میں لیے ہیں۔



بھائی محمد حسن قدوائی

۹ر اکتوبر ۱۹۸۰ء کی وہ صبح کتنی سیاہ تھی جب مجھے اپنے عزیز ترین دوست محمد حسن قدوائی کے انتقال کی خبر ملی اور میری آنکھوں کے سامنے وہ نقشہ کھنچ گیا جب ہم لوگ ۱۹۳۶ء میں جبلی کالج لکھنؤ میں پڑھنے کے لیے آئے تھے۔ محمد حسن بہرائچ سے ہائی اسکول پاس کر کے جبلی کالج لکھنؤ آئے تھے اور میں نے امیر الدولہ اسلامیہ کالج لکھنؤ سے پاس کیا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے پہلے سے واقف نہیں تھے۔ لیکن اردو اور معاشیات کے کلاس میں ہم دونوں کا ساتھ ہوتا تھا۔ پہلے دن جب اردو کے کلاس میں افسر میرٹھی صاحب نے انگریزی میں اپنی تقریر شروع کی تو اکثر لڑکے بہت مرعوب نظر آئے مگر محمد حسن اور میں مسکرا رہے تھے کلاس کے بعد بڑی دیر تک ہم لوگ اس موضوع پر بات چیت کرتے رہے اور اسی دن سے ہم دونوں کی دوستی کی بنیاد پڑی

اس کے بعد چند سالوں کے سوا میں ان کا برابر ساتھ رہا۔

اس زمانے میں محمد حسن، حیات اللہ انصاری صاحب کے ساتھ فرنگی محل پل کے پاس لب سڑک اوپر کے ایک مکان میں رہتے تھے محمد حسن کی وجہ سے میں کبھی وہاں جایا کرتا تھا وہاں حیات اللہ صاحب، عشرت صاحب بھائی رضا انصاری اور وجاہت علی سندیلوی سے ملاقات ہوئی۔ محمد حسن ہمیشہ دیر تک سونے کے عادی تھے اور میں ہمیشہ سے صبح جلد اٹھنے کا عادی تھا۔ جب میں ان کے یہاں جاتا تو یہ اکثر سوتے ملتے مگر ان کا ساتھ بڑے مستعد اور سوگھڑ آدمی کا تھا۔ حیات اللہ صاحب اتنے سوگھڑ تھے کہ حالات کی تنگی کے باوجود بڑے ٹھکانے سے رہتے تھے ان کے کمرے میں ایک بھاری بھرکم صوفہ سٹ رکھا تھا دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ اس صوفہ سٹ کا ڈھانچہ حیات اللہ صاحب نے نخاس سے خریدا تھا اور اپنی ھنرمندی سے اسے ایک اچھے صوفا سٹ میں تبدیل کر دیا تھا۔ بھائی محمد حسن کا یہ حال تھا کہ انھیں اپنا بستر بھی اپنے ہاتھ سے تہہ کرنا مشکل ہوتا تھا۔ محمد حسن کو شروع ہی سے تین چیز دل کا شوق تھا کتابوں کا، کاشتکاری کا اور عشق بتاں کا بقول

شخصے

ہ ازل سے حسن پرستی لکھی تھی قسمت میں
مرا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ تھا

زندگی کا کوئی ایسا دور نہیں گذرا جس میں وہ اس سے خالی رہے ہوں یوں وہ ہمیشہ کھوئے ہوئے رہتے تھے لیکن کوئی حسین چیز ان کی نظر سے بچ کر نہیں جا سکتی تھی۔ انھیں آرٹ کا اچھا خاصا ذوق تھا۔ لال بارہ دری میں جب تصویروں کی نمائش لگتی تو ضرور جاتے ہم لوگ سرسری طور پر تصویریں دیکھتے چلے جاتے اور کافی آگے نکل جاتے لیکن یہ کسی تصویر کے دیکھنے میں اتنے غرق ہو جاتے کہ ان کو ہم لوگوں کے آگے بڑھ جانے کا مطلق علم نہ ہوتا۔ نمائش سے واپسی پر اگر کوئی چھیڑ دیتا تو پھر وہ راستے بھر تصویروں کے رموز و نکات پر بڑی تفصیل سے لکچر دیتے تھے

اس زمانے میں کمیونزم کا بڑا زور تھا چنانچہ ان کے سرہانے ہر وقت کمیونزم پر کوئی نہ کوئی کتاب ضرور رہتی ہے اور خوب زور و شور کی بحث ہوتی۔ اس وقت معلوم نہیں کیوں کمیونسٹ نوجوانوں بال بڑھائے رکھنا کپڑے میلے رکھنا ضروری سمجھتے تھے شاید وہ اس طرح عام آدمی کی نمائندگی کرنے کی کوشش کرتے تھے لیکن خدا کا

شکر ہے کہ حیات اللہ صاحب محمد حسن اور عشرت علی صدیقی کمیونزم کی طرف رجحان رکھنے کے باوجود صاف ستھرے رہتے۔

کالج سے یونیورسٹی

اب ہم لوگ انٹر پاس کر کے جبلی کالج سے لکھنؤ یونیورسٹی میں آ گئے۔ میں ڈالی گنج میں کئی مکان بدلنے کے بعد چوراہے پر پچھم کی طرف اوپر والے ایک مکان میں نجم الدین قدوائی اور مولانا عبدالسلام قدوائی کے ساتھ رہ رہا تھا پہلے کچھ دنوں ہم لوگوں نے سامنے والے ہوٹل کا کھانا کھایا لیکن وہ زیادہ نہ چل سکا اور میں کرسی کے قریب کا ایک لڑکا کھانا پکانے کے لیے لے آیا اور اب گھر ہی میں کھانا پکنے لگا۔
محمد حسن نخاس ہی میں رہتے تھے یونیورسٹی آتے جاتے میں اکثر ہمارے یہاں آ جاتے ایک دن دوپہر کے وقت آئے اس زمانے میں یہ صحت بنانے کے چکر میں تھے عام طور پر پیدل چلتے تھے اس دن جب آئے تو بہت بھوکے تھے۔ تکلف کے نہ ہم قائل تھے اور نہ وہ انھوں نے آتے ہی اپنے بھوکے ہونے کا اعلان کر دیا۔ ہم لوگ کھانا کھا چکے تھے۔ نوکر نے ابھی کھانا نہیں کھایا تھا میں نے اس سے پکار کر کہا کہ بھئی کچھ کھانا ہو تو لے آؤ ایک شریف آدمی بہت بھوکا ہے۔ وہ کھانا لے آیا جب

محمد حسن تین چپاتیاں کھا چکے اور ابھی انھوں نے چاول کی طرف رخ نہیں کیا تو نوکر مسکرانے لگا محمد حسن نے اس کی مسکراہٹ دیکھ لی اور سمجھ گئے کہ وہ ان کی خوش خوراکی پر مسکرا رہا ہے۔ انھوں نے پوچھا اور چپاتیاں ہیں رہ گیا اور اپنے لیے جو تین چپاتیاں چھوڑ دی تھیں وہ بھی اٹھا لایا اب وہ نہیں محمد حسن مسکرا رہے تھے۔ اور ایک کے بعد دوسری چپاتی نوش کرتے چلے جا رہے تھے اس طرح چھ چپاتیاں کھانے کے بعد انھوں نے کہا اور ہیں تو اس نے کہا چپاتیاں نہیں چاول ہیں انھوں نے کہا اچھا چاول ہی لے آؤ اور دسترخوان پر رکھے چاولوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کیا چڑیا کے کھانے کے لیے لائے تھے اس کے بعد وہ سب چاول چٹ کر گئے۔

نوکر نے برتن اٹھائے اور پھر سے چولہا جلانے لگا تب محمد حسن بڑی زور سے ہنسے اور نوکر سے کہا کتنا کم کھانا پکاتے ہو معلوم ہوتا ہے اس مثل پر عمل کرتے ہو کہ نہ باسی بچے نہ کتا کھائے اس کے بعد انھوں نے اسے بلا کر پانچ روپئے دیئے اور کہا چولہا جلاؤ دوکان سے کھانا لا کر کھا لو اس نے تکلف کیا لیکن یہ کسی طرح مانے اور اسے چولہا جلانے نہیں دیا۔ اس کے بعد سے جب حسن آتے تو وہ لڑکا مسکراتا اور کہتا کیا بھیا کھائیں گے اس

پر وہ بھی ہنسنے لگتے اور اسے بطور انعام کچھ دیتے۔

بی اے کا آخری سال تھا۔ اب نجم الدین اور عبدالسلام قدوائی دونوں استاد کی حیثیت سے ندوہ میں ملازم ہو گئے تھے اور وہیں پورٹیکو کے اوپر والے کمرے میں رہنے لگے تھے۔ مولانا حیدر حسن صاحب اس وقت ندوہ کے مہتمم تھے میں رئیس احمد جعفری اور عبدالسلام قدوائی مولانا حیدر حسن سے حدیث پڑھ چکے تھے

مولانا فرشتہ خصلت آدمی تھے مولانا سے جب میں نے رہنے کے سلسلے میں اپنی پریشانی کا ذکر کیا تو انھوں نے عارضی طور پر ان کے ساتھ رہنے اور کھانے کی اجازت دیدی ندوہ میں غیر متعلق آدمی کے رہنے کی عام طور پر اجازت نہیں تھی۔ زیادہ دن رہنا بھی نہیں تھا، بی۔ اے کا امتحان شروع ہونے والا تھا۔ یہاں سے یونیورسٹی جانے آنے میں بڑی آسانی تھی چنانچہ میں بھی نجم الدین اور عبدالسلام صاحب کے ساتھ رہنے لگا۔

میں اور میرے ساتھی سال بھر ادھر ادھر کی کتابیں اور رسالے پڑھا کرتے تھے اور درسی کتابوں سے بہت کم دلچسپی رکھتے تھے۔ چنانچہ طے ہوا کہ جوائنٹ اسٹڈی کی جائے سید باقر حسین

محمد حسن قدوائی، معراج عظیم (وقار عظیم کے سب سے چھوٹے بھائی) ساتھ پڑھنے کے لیے یہیں آجاتے۔ گرمیوں کا زمانہ تھا پورٹیکو پر فرش بچھا کر پڑھتے تھے وہیں سو جاتے تھے مگر محمد حسن بہت کم ہم لوگوں کے ساتھ پڑھنے میں شریک ہو سکتے وہ ہمیشہ سے دیر میں سونے اور دیر میں اٹھنے کے عادی تھے۔ وہ فرنگی محل میں اپنے عزیزوں اور دوستوں سے مل ملا کر دس ساڑھے دس بجے رات کو آتے اور جب ہم لوگ سونے کی تیاری کرنے لگتے تو وہ بیڑی سلگا کر کتاب پڑھنے بیٹھتے۔ آدمی ذہین تھے اور جنرل نالج بہت اچھی تھی اس لیے کبھی فیل نہیں ہوئے۔

تحریک سول نافرمانی

بی اے پاس کرنے کے بعد محمد حسن نے تعلیم کا سلسلہ ختم کر دیا لیکن میں نے ایل، ایل بی جوائن کر لیا اس عرصے میں تحریک سول نافرمانی شروع ہو گئی حیات اللہ صاحب اور محمد حسن اور عشرت علی صدیقی پر گاندھی جی کے خیالات کا کافی اثر ہو چکا تھا اور وہ ہندوستانی ہفتہ وار اردو کے کانگریسی پرچے میں کام کر رہے تھے اس زمانے میں یہ لوگ قیصر باغ بارہ دری کے سامنے والے پھاٹک کے پاس نکڑ والے کمرے میں رہتے تھے جو رفیع احمد

قدوائی صاحب نے ایک راجہ صاحب سے دلوا دیا تھا۔ تحریک کی وجہ سے حکومت نے اخبارات، رسائل اور تمام تعلیمی ادارے بند کر دیئے تھے میں اپنے گھر سہالی چلا گیا تھا۔ وہاں جمیسن کا دستی خط ملا کر فوراً چلے آؤ۔ میری شادی ہو چکی تھی گھر والے یہ نہیں چاہتے تھے کہ میں اس پر آشوب زمانے میں لکھنؤ جاؤں لیکن میں کسی نہ کسی طرح یہاں پہونچ گیا۔ اس درمیان جتنے چھوٹے بڑے کانگریسی لیڈر تھے گرفتار کر لیے گئے تھے یہاں آکر معلوم ہوا کہ خفیہ طور پر ایک ہفتہ وار اردو اخبار نکالنے کی اسکیم ہے۔ ایک کانگریسی صاحب نے اپنے پریس میں چھاپنے کا وعدہ بھی کر لیا ابھی ہم لوگ اخبار نکالنے کی اسکیم ہی بنا رہے تھے کہ راجہ صاحب کا ایک کارندہ آیا اور اس نے کہا کہ خفیہ پولیس نے رپورٹ دی ہے کہ راجا صاحب نے بہت خطرناک آدمیوں کو اپنے یہاں جگہ دے رکھی ہے اس لیے آپ لوگ مہربانی کر کے فوراً مکان خالی کر دیجئے ورنہ آپ لوگوں کے ساتھ راجا صاحب پر بھی مصیبت آجائے گی۔ ہم لوگوں نے فوراً مکان خالی کر دیا اور سامان جگور محمد حسن کے یہاں پہونچا دیا گیا۔

اس کے بعد معلوم ہوا کہ بہن امتہ السلام اپنی نگرانی میں

بمبئی سے خفیہ طور پر کوئی اخبار نکالنا چاہتی ہیں حیات اللہ صاحب، محمد حسن اور عشرت علی صدیقی وہاں جانے کی تیاری کرنے لگے۔ لیکن میں نے کہا مجھے ابھی ایل ایل بی کا امتحان دینا ہے دوسرے گھر والے بمبئی جانے کی کسی طرح اجازت نہیں دیں گے اس لیے افسوس ہے کہ میں بمبئی نہ جاسکوں گا۔ اس کے بعد میں گھر چلا گیا۔ کچھ دنوں بعد لیڈر لوگ رہا کر دیئے گئے اور رفیع احمد صاحب نے الیکشن میں مسلم لیگ کے مقابلے کے لیے ایک اردو روزنامہ نکالنے کا ارادہ کیا اور حیات اللہ صاحب کو بلوا کر یہ کام ان کے سپرد کر دیا۔ حیات اللہ صاحب محمد حسن اور عشرت صاحب نے فوراً انتظامات شروع کر دیئے حیات اللہ صاحب نے مجھے بھی خط لکھا مجھے وکالت شروع کیے ابھی ڈیڑھ سال ہوئے تھے میرا وکالت میں بالکل دل ہی نہیں لگتا تھا۔ بھائیوں کے اصرار پر مارے باندھے کچہری چلا جاتا تھا اور تخت پر بیٹھ کر اخبار پڑھا کرتا تھا اور سیاسی مسائل پر لوگوں سے بحث کیا کرتا تھا۔ خط کیا ملا مانگی مراد ملی اور میں وکالت کا تخت چھوڑ کر صحافت کی چکی چلانے لکھنؤ چلا آیا غالباً یہ ۱۹۴۶ء تھا یہاں قومی آواز میں محمد حسن کا اور میرا ساتھ قریب قریب تیس برس رہا۔

اوبہن (پانی بھرنے کی رسی) اٹھا کر نیم کے کسی نیچے جنگھے (موٹی شاخ) میں
عارضی طور پر بغیر پیڑے کا جھولا ڈال دیتے اور اس طرح بچول کی بلا
اپنے سر سے ٹال دیتے۔

گیان دادا ہمارے گھر کے بہت پرانے ملازم تھے چکلہ دار محمد روشن
کے خاندان سے گیا دین دادا کے گھرانے کا شاہی زمانے سے تعلق تھا۔
اس تعلق کو گیا دین دادا بھی اپنے پوروجوں کی پوتر دھروہر کی طرح
سینے سے لگائے ہوئے تھے اور انھوں نے کبھی اس خاندان کے نام
کو نیچا نہ ہونے دیا اور جب کبھی کوئی ایسا آڑا وقت آیا تو اپنی
جان کی بازی لگا دی۔

تعلقہ تو کب کا کرکب کا ختم ہو چکا تھا لیکن چھ گاؤں میں
راجہ کے مقابلہ میں تہائی حصہ اب بھی باقی تھا۔ انھیں چھ گاؤں
سے ایک گاؤں فتحا پور میں گیا دین دادا کا خاندان معلوم نہیں
کب سے رہتا چلا آرہا تھا۔ اس گاؤں میں اسی فیصدی آبادی
شورہ پشت پاسیوں کی تھی گیا دین دادا کا تعلق اس جوار کے نامی
ڈاکو پرتیم پاسی کے خاندان سے تھا جس کے نام سے بڑے بڑے
زمینداروں کی سٹی گم ہوتی تھی۔ گیا دین دادا ڈاکو تو نہ تھے لیکن
بڑے گروہ بند اور لٹھیت (لاٹھی باز) تھے ان کی ایک ہانک

پر سینکڑوں پاسی پل بھر میں اکٹھا ہو سکتا تھا ہم نے خود تو گیا دین دادا کی لٹھیتی دیکھی نہ تھی لیکن جب وہ مزے میں آکر اپنی جوانی کی فوجداری کے قصے سناتے تو ہمارے رونگٹے کھڑے ہو جاتے وہ بتاتے کہ ایک مرتبہ جب ان کے پٹیتوں نے (مخالفوں نے) بڑا گھیراؤ کر کے انھیں راستے میں گھیر لیا تو یہ سر میں مُریٹھا (لنگوٹا) باندھ اپنے گولے دار لاٹھی لے کمر بانے کے ہاتھ گھمانے لگے جس سے آدمیوں کی بھیڑ کائی کی طرح چھٹ گئی اور یہ صاف بچ کر نکل آئے

اگر کھنڈر دیکھ کر عمارت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے تو ہم گیا دین دادا کے بڑھاپے سے ان کی جوانی کا اندازہ کر سکتے ہیں وہ ساٹھ برس کی عمر میں بھی ساٹھے پاٹھے تھے اور لمبے ہونے کے باوجود ان کی کمر کمان کی طرح جھکی نہیں بلکہ تیر کی مانند سیدھی تھی وہ اب بھی اپنے قد سے ایک ہاتھ اونچی جہندری اور تیل لگی گولے دار لاٹھی کندھے پر رکھ کر جوانوں کی طرح مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے چلتے تھے لمبے قد کے ساتھ ان کا جسم گرانڈ تھا لیکن بڑھاپے کی وجہ سے ان کی گردن کی کھال لٹک آئی تھی اور سیاہی مائل چہرے پر جھریاں کنمنانے لگی تھیں ان کا ماتھا چوڑا، آنکھ بڑی ناک لمبی لیکن قدرے موٹی تھی ہونٹ نہ پتلے نہ موٹے ان کا بڑا سا منہ بتیسی

سے بالکل خالی تھا، لیکن بڑی گھنی سفید مونچھیں ان کے پوپلے پن کو چھپائے ہوئے تھیں ان کی چندیا صاف نہ تھی بلکہ گھنے بال تھے مگر وہ اتنی پابندی سے پگڑی باندھتے تھے کہ انھیں ننگے سر دیکھنے کو آنکھیں ترس گئیں وہ بڑھاپے میں بھی کپڑے لتے کا بڑا خیال رکھتے تھے مارکین کا لمبی آستین والا کرتا کسی ہوئی اونچی دھوتی۔ دہی پیا اور تیل میں ڈوبا چرمر کرتا ہوا جوتا پہن کر جب وہ لمبی لاٹھی کاندھے پر رکھے ہوئے نکلتے تو بہتوں کی جوانی ان کے بڑھاپے پر رشک کرنے لگتی۔

گیادین دادا اپنے گاؤں سے دن میں ایک مرتبہ لباوان پور میں عزیز میاں کے مکان بارہ دری کی ڈیوڑھی پر حاضری دینے ضرور آتے ہم لوگ ان کی آمد کا بے چینی سے انتظار کرتے کیونکہ وہ کبھی خالی ہاتھ نہ آتے ان کے انگوچھے میں بچوں کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور بندھا ہوتا کبھی گڑ کی بھیلی، کبھی سنگھاڑے کی گودی، کبھی بوٹ، کبھی مٹر کی پھلی غرض فصل کی کوئی نہ کوئی چیز ضرور لاتے۔

ایک دن انگوچھے میں سنگھاڑے باندھے اور لاٹھی کاندھے پر رکھے لمبے لمبے ڈگ مارتے چلے آرہے تھے، کہ انھوں نے سنا کوئی انھیں پکار رہا ہے وہ فوراً ادھر مڑ گئے انھوں نے دیکھا کہ عزیز میاں کا ایک اسامی رو رو کر کہہ رہا ہے کہ "راجہ کے سپاہی تلاؤ

(تالاب) سے بیڑی ناہی لگا دے دیت ہیں، کہت ہیں پہلے راجا کے تہنتول کیر بیڑی لگی پھر میاں کے اسامی کھیت سینچ ہیں۔" یہ سننا تھا کہ گیا دین دادا کے بدن میں آگ لگ گئی اور انھوں نے راجہ کے سپاہیوں سے للکار کر کہا "کا جان سے بیدھے ہو۔ جبلے گیا دین جیت ہیں تو نہ ہوئے دے ہیں" اور آؤ دیکھا نہ تاؤ لپک کر ایک سپاہی پر لاٹھی چلا دی ابھی یہ گھومنے نہ پائے تھے کہ دوسرے سپاہی نے بیٹھ کر ان کے گھٹنے پر لاٹھی ماردی یہ لڑکھڑائے لیکن گرتے گرتے اس کے پیٹ میں لاٹھی کا ہورا اتنے زور سے مارا کہ وہ پیٹ پکڑ کر بیٹھ گیا اب پہلا سپاہی سنبھل چکا تھا اس نے جھپٹ کر گیا دین دادا پر وار کیا لیکن اس کی لاٹھی آم کی ایک شاخ میں الجھ کر رہ گئی وہ دوسرا وار کرنے ہی والا تھا کہ اس نے دیکھا کہ گیا دین دادا کے گاؤں سے لوگ گالیاں دیتے لاٹھیاں لیے دوڑے چلے آرہے ہیں اس نے لاٹھی چلائی تو لیکن گھبراہٹ میں وار اوچھا پڑا پھر بھی گیا دین دادا کی پگڑی خون سے تر بتر ہو گئی۔ انھوں نے خون پونچھتے ہوئے عزیز میاں کے اسامی سے کہا بیڑی لگا راجہ کے ہرے سپاہی بھاگ گئے۔ عزیز میاں کو جیسے ہی خبر ہوئی وہ گیا دین دادا کو گھر لے آئے اور جب تک وہ بالکل اچھے نہ ہو گئے

انھیں جانے نہ دیا۔ اور آم کا ایک پرانا باغ ان کے نام لکھ دیا
گیا دین دادا کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اگر کوئی ان سے قرض
مانگتا تو وہ اسے کبھی مایوس نہ کرتے اس میں ایک جذبہ تو ہمدردی کا
تھا اور دوسرا جذبہ شان کا تھا گیا دین دادا کوئی مالدار آدمی نہ تھے مگر رہتے ٹھاٹھ باٹھ
سے تھے گھر کچا تھا لیکن باہر بیٹھکا انھوں نے کچی اینٹیں پتھوا کر بنوایا
تھا اور کودوں کی بھوسی ملوا کر کتنی سے مٹی لگوائی تھی۔ بیٹھکے میں ایک
بڑا تخت، سینٹھے کے بنے دو مونڈھے، لکڑی کی ایک پٹالی اور دو چار
مونج کے بنڈرے پڑے رہتے، نیالی میں ہر وقت آگ دبی رہتی اور چلم کا
دور چلتا رہتا

سواری اور شان کے لیے ایک ٹانگھن نیم کے نیچے بندھا
ہنہنایا کرتا انھیں شکار کا بھی شوق تھا اس لیے ایک تازی کتا بھی پال
رکھا تھا جو چوگڑے یعنی خرگوش کا شکار کیا کرتا تھا۔ ٹھاٹھ باٹھ کے
باوجود گیا دین دادا کے پاس اتنا روپیہ نہ تھا کہ وہ قرض بانٹتے لیکن اپنی
ساکھ برقرار رکھنے کے لیے وہ ہماری دادی اماں سے قرض لے کر
لوگوں کو قرض دیا کرتے تھے اور شان میں مگن رہتے تھے۔
گیا دین دادا کے کوئی لڑکا نہ تھا تین لڑکیاں تھیں بڑی لڑکی کا بیاہ
گھر داماد کیا تھا۔ داماد اور اس کے بچے انہی کے ساتھ رہتے تھے سب

سے چھوٹی لڑکی سندریا ہماری ہم عمر تھی اور جب ہم گیا دین دادا کے ساتھ ان کے گھوڑے پر بیٹھ کر جاتے تو وہ بہت خوش ہو جاتی اور ہم دونوں گیا دین دادا کے باغ میں گھنٹوں کھیلا کرتے اور امرود اور بیر توڑ کر کھایا کرتے۔

گیا دین دادا کو ہمارے والد عزیز میاں نے جو باغ دیا تھا اس کی وہ بڑی دیکھ ریکھ کرتے کیا مجال کوئی ایک پتہ کبھی توڑے انھوں نے کھائیں پر پتاور، چار کونوں پر چاؤ بانس اور کنارے کنارے امرود اور بیر کے پیڑ لگائے تھے اور بیچ میں آم کے نئے درخت لگا کر پرانے باغ کو نیا جنم دیا تھا۔

آخر وقت میں گیا دین دادا کو دمے کی شکایت ہو گئی تھی۔ عزیز میاں نے ان کا بڑا علاج کیا لیکن دمہ دم کے ساتھ ہے۔ جان لے کر ہی دم لیتا ہے جب ان کی زیادہ حالت خراب ہوئی تو ہمارا پورا گھر انھیں دیکھنے گیا جس میں دادی اماں بھی شامل تھیں۔ گیا دین دادا نے چپکے سے دادی اماں سے کوئی بات کہی اور دادی اماں آنکھوں میں آنسو لیے رندھی ہوئی آواز میں بولیں، میں نے معاف کیا میرے اللہ نے معاف کیا، غالباً گیا دین دادا نے قرض معاف کرایا تھا۔

دوسرے دن یہ خبر آئی کہ گیا دین دادا چل بسے۔ ان کی وصیت کے مطابق عزیز میاں کے دیئے ہوئے باغ میں ان کی سمادھی بنائی گئی۔ اب ان کی جگہ ان کا داماد بدلو کام کرنے لگا۔

ایک دن ہم اس کے ساتھ گیا دین دادا کے گھر گئے تو سندریا ہم کو دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ہماری آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے بعد کو ہم دونوں باغ گئے کھیلنے نہیں گیا دین دادا سے ملنے گیا دین دادا نے باغ میں روش بنوا کر اس کے کنارے بیلا اور کونے پر تلسی لگوائی تھی کالے بادل گھر کر آ گئے تھے اور بوندا باندی شروع ہو گئی تھی ہم دونوں گیا دین دادا کی سمادی کے پاس خاموش کھڑے تھے میں کچھ سوچ کر بیلے کا ایک پودا دوسرے کونے پر لگا دیا یہ دیکھ کر سندریا نے تلسی کا پودا دوسرے کونے پر لگا دیا۔

زمینداری ختم ہو گئی ہم لوگ شہر چلے آئے، سندریا بیاہ کر سسرال چلی گئی لیکن بیلا اور تلسی بڑھ کر اب بھی گیا دین دادا کو اپنی آغوش میں لیے ہیں۔



بھائی محمد حسن قدوائی

۹ر اکتوبر ۱۹۸۰ء کی وہ صبح کتنی سیاہ تھی جب مجھے اپنے عزیز ترین دوست محمد حسن قدوائی کے انتقال کی خبر ملی اور میری آنکھوں کے سامنے وہ نقشہ کھنچ گیا جب ہم لوگ ۱۹۳۶ء میں جبلی کالج لکھنؤ میں پڑھنے کے لیے آئے تھے محمد حسن بہرائچ سے ہائی اسکول پاس کر کے جبلی کالج لکھنؤ آئے تھے اور میں نے امیر الدولہ اسلامیہ کالج لکھنؤ سے پاس کیا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے پہلے سے واقف نہیں تھے۔ لیکن اردو اور معاشیات کے کلاس میں ہم دونوں کا ساتھ ہوتا تھا۔ پہلے دن جب اردو کے کلاس میں افسر میرٹھی صاحب نے انگریزی میں اپنی تقریر شروع کی تو اکثر لڑکے بہت مرعوب نظر آئے مگر محمد حسن اور میں مسکرا رہے تھے کلاس کے بعد بڑی دیر تک ہم لوگ اس موضوع پر بات چیت کرتے رہے اور اسی دن سے ہم دونوں کی دوستی کی بنیاد پڑی

اس کے بعد چند سالوں کے سوا میرا ان کا برابر ساتھ رہا۔

اس زمانے میں محمد حسن، حیات اللہ انصاری صاحب کے ساتھ فرنگی محل پل کے پاس لب سڑک اوپر کے ایک مکان میں رہتے تھے محمد حسن کی وجہ سے میں کبھی وہاں جایا کرتا تھا وہاں حیات اللہ صاحب، عشرت صاحب بھائی رضا انصاری اور وجاہت علی سندیلوی سے ملاقات ہوئی۔ محمد حسن ہمیشہ دیر تک سونے کے عادی تھے اور میں ہمیشہ سے صبح جلد اٹھنے کا عادی تھا۔ جب میں ان کے یہاں جاتا تو یہ اکثر سوتے ملتے مگر ان کا ساتھ بڑے مستعد اور سوگھڑ آدمی کا تھا۔ حیات اللہ صاحب اتنے سوگھڑ تھے کہ حالات کی تنگی کے باوجود بڑے ٹھکانے سے رہتے تھے ان کے کمرے میں ایک بھاری بھرکم صوفہ سٹ رکھا تھا دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ اس صوفہ سٹ کا ڈھانچہ حیات اللہ صاحب نے نخاس سے خریدا تھا اور اپنی ہنرمندی سے اسے ایک اچھے صوفا سٹ میں تبدیل کر دیا تھا۔ بھائی محمد حسن کا یہ حال تھا کہ انھیں اپنا بستر بھی اپنے ہاتھ سے تہہ کرنا مشکل ہوتا تھا۔ محمد حسن کو شروع ہی سے تین چیزوں کا شوق تھا کتابوں کا، کاشتکاری کا اور عشق بتاں کا بقول

شخصے

ازل سے حسن پرستی لکھی تھی قسمت میں
مرا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ تھا

زندگی کا کوئی ایسا دور نہیں گزرا جس میں وہ اس سے خالی رہے ہوں یوں وہ ہمیشہ کھوئے کھوئے ہوئے رہتے تھے لیکن کوئی حسین چیز ان کی نظر سے بچ کر نہیں جا سکتی تھی۔ انھیں آرٹ کا اچھا خاصا ذوق تھا۔ لال بارہ دری میں جب تصویروں کی نمائش لگتی تو ضرور جاتے ہم لوگ سرسری طور پر تصویریں دیکھتے چلے جاتے اور کافی آگے نکل جاتے لیکن یہ کسی تصویر کے دیکھنے میں اتنے غرق ہو جاتے کہ ان کو ہم لوگوں کے آگے بڑھ جانے کا مطلق علم نہ ہوتا۔ نمائش سے واپسی پر اگر کوئی چھیڑ دیتا تو پھر وہ راستے بھر تصویروں کے رموز و نکات پر بڑی تفصیل سے لکچر دیتے تھے

اس زمانے میں کمیونزم کا بڑا زور تھا چنانچہ ان کے سرہانے ہر وقت کمیونزم پر کوئی نہ کوئی کتاب ضرور رہتی ہے اور خوب زور و شور کی بحث ہوتی۔ اس وقت معلوم نہیں کیوں کمیونسٹ نوجوانوں بال بڑھائے رکھنا کپڑے میلے رکھنا ضروری سمجھتے تھے شاید وہ اسی طرح عام آدمی کی نمائندگی کرنے کی کوشش کرتے تھے لیکن خدا کا

شکر ہے کہ حیات اللہ صاحب محمد حسن اور عشرت علی صدیقی کمیونزم کی طرف رجحان رکھنے کے باوجود صاف ستھرے رہتے۔

کالج سے یونیورسٹی

اب ہم لوگ انٹر پاس کر کے جبلی کالج سے لکھنؤ یونیورسٹی میں آ گئے۔ میں ڈالی گنج میں کئی مکان بدلنے کے بعد چوراہے پر پچھم کی طرف اوپر والے ایک مکان میں نجم الدین قدوائی اور مولانا عبدالسلام قدوائی کے ساتھ رہ رہا تھا پہلے کچھ دنوں ہم لوگوں نے سامنے والے ہوٹل کا کھانا کھایا لیکن وہ زیادہ نہ چل سکا اور میں کرسی کے قریب کا ایک لڑکا کھانا پکانے کے لیے لے آیا اور اب گھر ہی میں کھانا پکنے لگا۔ محمد حسن نخاس ہی میں رہ رہے تھے یونیورسٹی آتے جاتے میں اکثر ہمارے یہاں آ جاتے ایک دن دوپہر کے وقت آئے اس زمانے میں یہ صحت بنانے کے چکر میں تھے عام طور پر پیدل چلتے تھے اس دن جب آئے تو بہت بھوکے تھے۔ تکلف کے نہ ہم قائل تھے اور نہ وہ انھوں نے آتے ہی اپنے بھوکے ہونے کا اعلان کر دیا۔ ہم لوگ کھانا کھا چکے تھے۔ نوکر نے ابھی کھانا نہیں کھایا تھا میں نے اس سے پکار کر کہا کہ بھئی کچھ کھانا ہو تو لے آؤ ایک شریف آدمی بہت بھوکا ہے۔ وہ کھانا لے آیا جب

محمد حسن تین چپاتیاں کھا چکے اور ابھی انھوں نے چاول کی طرف رخ نہیں کیا تو نوکر مسکرانے لگا محمد حسن نے اس کی مسکراہٹ دیکھ لی اور سمجھ گئے کہ وہ ان کی خوش خوراکی پر مسکرا رہا ہے۔ انھوں نے پوچھا اور چپاتیاں ہیں رہ گیا اور اپنے لیے جو تین چپاتیاں چھوڑ دی تھیں وہ بھی اٹھا لایا اب وہ نہیں محمد حسن مسکرا رہے تھے۔ اور ایک کے بعد دوسری چپاتی نوش کرتے چلے جا رہے تھے اس طرح چھ چپاتیاں کھانے کے بعد انھوں نے کہا اور ہیں تو اس نے کہا چپاتیاں نہیں چاول ہیں انھوں نے کہا اچھا چاول ہی لے آؤ اور دستر خوان پر رکھے چاولوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کیا چڑیا کے کھانے کے لیے لائے تھے اس کے بعد وہ سب چاول چٹ کر گیے۔

نوکر نے برتن اٹھائے اور پھر سے چولہا جلانے لگا تب محمد حسن بڑی زور سے ہنسے اور نوکر سے کہا کتنا کم کھانا پکاتے ہو معلوم ہوتا ہے اس مثل پر عمل کرتے ہو کہ نہ باسی بچے نہ کتا کھائے اس کے بعد انھوں نے اسے بلا کر پانچ روپئے دیئے اور کہا چولہا جلاؤ دو کان سے کھانا لا کر کھا لو اس نے تکلف کیا لیکن یہ کسی طرح مانے اور اسے چولہا جلانے نہیں دیا۔ اس کے بعد سے جب محمد حسن آتے تو وہ لڑکا مسکراتا اور کہتا کیا بھیا کھائیں گے اس

پر وہ بھی ہنسنے لگتے اور اسے بطور انعام کچھ دیتے ۔

بی اے کا آخری سال تھا۔ اب نجم الدین اور عبدالسلام قدوائی دونوں استاد کی حیثیت سے ندوہ میں ملازم ہو گئے تھے اور وہیں پورٹیگو کے اوپر والے کمرے میں رہنے لگے تھے۔ مولانا حیدر حسن صاحب اس وقت ندوہ کے مہتمم تھے میں رئیس احمد جعفری اور عبدالسلام قدوائی مولانا حیدر حسن سے حدیث پڑھ چکے تھے

مولانا فرشتہ خصلت آدمی تھے مولانا سے جب میں نے رہنے کے سلسلے میں اپنی پریشانی کا ذکر کیا تو انھوں نے عارضی طور پر ان کے ساتھ رہنے اور کھانے کی اجازت دیدی ندوہ میں غیر متعلق آدمی کے رہنے کی عام طور پر اجازت نہیں تھی۔ زیادہ دن رہنا بھی نہیں تھا، بی۔ اے کا امتحان شروع ہونے والا تھا۔ یہاں سے یونیورسٹی جانے آنے میں بڑی آسانی تھی چنانچہ میں بھی نجم الدین اور عبدالسلام صاحب کے ساتھ رہنے لگا۔

میں اور میرے ساتھی سال بھر ادھر ادھر کی کتابیں اور رسالے پڑھا کرتے تھے اور درسی کتابوں سے بہت کم دلچسپی رکھتے تھے ۔ چنانچہ طے ہوا کہ جوائنٹ اسٹڈی کی جائے سید باقر حسین

محمد حسن قدوائی، معراج عظیم (وقار عظیم کے سب سے چھوٹے بھائی) ساتھ پڑھنے کے لیے یہیں آجاتے۔ گرمیوں کا زمانہ تھا پورٹیکو پر فرش بچھا کر پڑھتے تھے وہیں سو جاتے تھے مگر محمد حسن بہت کم ہم لوگوں کے ساتھ پڑھنے میں شریک ہو سکتے وہ ہمیشہ سے دیر میں سونے اور دیر میں اٹھنے کے عادی تھے۔ وہ فرنگی محل میں اپنے عزیزوں اور دوستوں سے مل ملا کر دس ساڑھے دس بجے رات کو آتے اور جب ہم لوگ سونے کی تیاری کرنے لگتے تو وہ بیڑی سلگا کر کتاب پڑھنے بیٹھتے۔ آدمی ذہین تھے اور جنرل نالج بہت اچھی تھی اس لیے کبھی فیل نہیں ہوئے۔

تحریک سول نافرمانی بی اے پاس کرنے کے بعد محمد حسن نے تعلیم کا سلسلہ ختم کر دیا لیکن میں نے ایل، ایل بی جوائن کر لیا اس عرصے میں تحریک سول نافرمانی شروع ہو گئی حیات اللہ صاحب اور محمد حسن اور عشرت علی صدیقی پر گاندھی جی کے خیالات کا کافی اثر ہو چکا تھا اور وہ ہندستان ہفتہ وار اردو کے کانگریسی پرچے میں کام کر رہے تھے اس زمانے میں یہ لوگ قیصر باغ بارہ دری کے سامنے والے کچا ٹک کے پاس نکڑ والے کمرے میں رہتے تھے جو رفیع احمد

قدوائی صاحب نے ایک راجہ صاحب سے دلوا دیا تھا۔ تحریک کی وجہ سے حکومت نے اخبارات، رسائل اور تمام تعلیمی ادارے بند کر دیئے تھے میں اپنے گھر سہالی چلا گیا تھا۔ وہاں محمد حسن کا دستی خط ملا کر فوراً چلے آؤ۔ میری شادی ہو چکی تھی گھر والے یہ نہیں چاہتے تھے کہ میں اس پر آشوب زمانے میں لکھنؤ جاؤں لیکن میں کسی نہ کسی طرح یہاں پہونچ گیا۔ اس درمیان جتنے چھوٹے بڑے کانگریسی لیڈر تھے گرفتار کر لیے گئے تھے یہاں آ کر معلوم ہوا کہ خفیہ طور پر ایک ہفتہ وار اردو اخبار نکالنے کی اسکیم ہے۔ ایک کانگریسی صاحب نے اپنے پریس میں چھاپنے کا وعدہ بھی کر لیا ابھی ہم لوگ اخبار نکالنے کی اسکیم ہی بنا رہے تھے کہ راجہ صاحب کا ایک کارندہ آیا اور اس نے کہا کہ خفیہ پولیس نے رپورٹ دی ہے کہ راجا صاحب نے بہت خطرناک آدمیوں کو اپنے یہاں جگہ دے رکھی ہے اس لیے آپ لوگ مہربانی کر کے فوراً مکان خالی کر دیجئے ورنہ آپ لوگوں کے ساتھ راجا صاحب پر بھی مصیبت آ جائے گی۔ ہم لوگوں نے فوراً مکان خالی کر دیا اور سامان جگور محمد حسن کے یہاں پہونچا دیا گیا۔

اس کے بعد معلوم ہوا کہ بہن امۃ السلام اپنی نگرانی میں

بمبئی سے خفیہ طور پر کوئی اخبار نکالنا چاہتی ہیں۔ حیات اللہ صاحب، محمد حسن اور عشرت علی صدیقی وہاں جانے کی تیاری کرنے لگے۔ لیکن میں نے کہا مجھے ابھی ایل ایل بی کا امتحان دینا ہے دوسرے گھر والے بمبئی جانے کی کسی طرح اجازت نہیں دیں گے اس لیے افسوس ہے کہ میں بمبئی نہ جا سکوں گا۔ اس کے بعد میں گھر چلا گیا۔ کچھ دنوں بعد لیڈر لوگ رہا کر دیئے گئے اور رفیع احمد صاحب نے الیکشن میں مسلم لیگ کے مقابلے کے لیے ایک اردو روزنامہ نکالنے کا ارادہ کیا اور حیات اللہ صاحب کو بلوا کر یہ کام ان کے سپرد کر دیا۔ حیات اللہ صاحب محمد حسن اور عشرت صاحب نے فوراً انتظامات شروع کر دیئے حیات اللہ صاحب نے مجھے بھی خط لکھا مجھے وکالت شروع کیے ابھی ڈیڑھ سال ہوئے تھے میرا وکالت میں بالکل دل ہی نہیں لگتا تھا۔ بھائیوں کے اصرار پر مارے باندھے کچہری چلا جاتا تھا اور تخت پر بیٹھ کر اخبار پڑھا کرتا تھا اور سیاسی مسائل پر لوگوں سے بحث کیا کرتا تھا۔ خط کیا ملا مانگی مراد ملی اور میں وکالت کا تخت چھوڑ کر صحافت کی چکی چلانے لکھنؤ چلا آیا غالباً یہ ۱۹۴۶ء تھا یہاں قومی آواز میں محمد حسن کا اور میرا ساتھ قریب قریب تئیس برس رہا۔

ہم لوگوں نے کام شروع کر دیا۔ تنخواہ کے بارے میں کوئی بات چیت ہی نہیں کی۔ اس کے بعد جو تنخواہ ملنے لگی اسے صبر و شکر کے ساتھ قبول کر لیا اس وقت تک زمینداری ختم نہیں ہوئی تھی محمد حسن کے یہاں بھی زمینداری تھی اور میرے یہاں بھی اسی لیے پیسے کا مسئلہ زیادہ اہم نہیں تھا۔ اچھی طرح یاد نہیں کب لیکن اسی درمیان محمد حسن کی شادی ہو گئی ان کی شادی ہمارے گاؤں سہالی کے قریب تحصیل فتحپور سے ہوئی ان کی بیوی ہمارے جوار کی بھی تھیں اور دور کی رشتہ دار بھی قومی آواز میں تنخواہ تو بہت کم تھی لیکن کام اپنی پسند کا تھا۔ اور ماحول عام دفتروں جیسا نہیں بلکہ بھائی چارے والا تھا۔ اس لیے کام کی زیادتی کے باوجود تکان محسوس نہ ہوتا دفتر آنے کا انتظار رہتا اور جانے کو دل نہ چاہتا شروع میں اسٹاف میں حیات اللہ صاحب عشرت صاحب محمد حسن، مسیح الحسن رضوی اور میں تھا اس کے بعد لوگ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا۔

شفٹ انچارج

محمد حسن، مسیح الحسن رضوی اور میں ٹیلی پرنٹر دیکھتے تھے اور شفٹ انچارج تھے محمد حسن کی یہ عادت تھی کہ وہ کوئی کام ہول جھول میں نہ کرتے تھے جو کام کرتے تھے چاہتے تھے کہ ماسٹر پیس ہو۔ چنانچہ وہ خبروں کا ترجمہ بہت دل لگا کر کرتے تھے اور واقعی ترجمہ ایسا ہوتا تھا کہ اصل سے مطابق بھی ہوتا تھا اور سلیس اور شستہ بھی ہوتا جس میں دیر لگتی اخبار

یہی کام بڑی تیزی سے ہوتا ہے۔ جب وہ شفٹ انچارج ہوتے تو کاپی پریس میں کبھی وقت سے نہ جا پاتی۔ وہ وقت کے کبھی پابند نہیں رہے بلکہ وہ وقت کو اپنا پابند سمجھتے تھے وہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ دیر سے آتے اس کے بعد کرسی پر بیٹھ کر نہایت اطمینان سے مڈ (درمیان) کی کاپی پڑھتے پھر ٹرے میں رکھی ہوئی خبروں کو بڑے غور سے دیکھتے جتنی اہم خبریں ہوتیں وہ اپنے لیے رکھتے ان کے ساتھ کام کرنے والے سب ایڈیٹر بیٹھے خبریں ملنے کا انتظار کیا کرتے وہ اپنے کام میں مداخلت کبھی پسند نہ کرتے تھے جب لوگ کہتے قدوائی صاحب ہم لوگ خالی بیٹھے ہیں تو وہ چونک پڑتے اور ایک ایک خبر اٹھا کر انھیں دیدیتے۔

اس کے بعد وہ کھڑے ہوکر دونوں ہاتھوں کو جھٹکتے اور موڑ کر پیچھے کی طرف لے جاتے اور سینہ تان دیتے یہ ایک قسم کا سگنل تھا کہ قدوائی صاحب ترجمے پر جٹنے والے ہیں اور قلم لے کر ترجمے پر اسی طرح جٹ جاتے کہ ان کو سوائے بیڑی کے کھانے پینے کا بھی ہوش نہ رہتا۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ کاپی پریس جانے کا وقت آجاتا کاتب چیخ پکار مچانے لگتے تب قدوائی صاحب اپنی پسند کی اہم خبریں جو انھوں نے اپنے لیے نکال کر رکھی تھیں اپنے ساتھیوں میں جلدی جلدی تقسیم کرنے لگتے تب پورے زور شور سے کام شروع ہوتا۔ ادھر کاپی جاتی ادھر خبریں ترجمہ کرکے دنادن بھیجی

جاتیں تیز کاتب برق رفتاری سے لکھنے لگتے اور اس طرح بڑی مشکل سے کاپی تیار ہوتی فلیش کی سرخی تو وہ کہنے سننے سے پہلے ہی بھیج دیتے لیکن فلیش کی خبر آخر وقت تک لکھی جاتی رہتی وہ کاپی پریس جانے کے بعد بھی جب تک اپنی کسی نامکمل خبر کا ترجمہ مکمل نہ کر لیتے کرسی سے نہ اٹھتے چنانچہ گھر پہنچنے میں ان کو ہمیشہ دیر ہو جاتی۔

دن کی ڈیوٹی میں کام ذرا اطمینان سے ہوتا تھا زیادہ عجلت نہیں ہوتی تھی اس لیے ان کے ساتھ کام کرنے والے لوگ قدوائی صاحب کا پسندیدہ موضوع سکس چھیڑ دیتے اور پھر وہ عینک اتار دیتے اور قلم رکھ دیتے اس موضوع سے متعلق ان کے معلومات قابل رشک تھے وہ اپنے تجربات سے لے کر بندر، گھوڑے، بکری، چڑیاں، چڑے کے جنسی تعلقات کے بارے میں ایسے انکشافات کرتے کہ ہم لوگ دنگ رہ جاتے وہ باتوں میں ایسے محو ہو جاتے کہ انھیں سب ایڈیٹروں کو خبریں دینے اور کاپی وقت سے بھیجنے کا مطلق خیال نہ رہتا تب ساتھی خود ان کی توجہ اس طرف مبذول کراتے اور وہ چونک پڑتے اور جلدی جلدی کام شروع کر دیتے وہ اگر کبھی پروف ریڈروں، کاتبوں یا چپراسیوں کی کی کوئی بات ناپسند کرتے تو خود ہی ان کو سمجھا بجھا دیتے حیات اللہ صاحب یا عشرت صاحب سے شکایت نہ کرتے وہ بڑے ہمدرد اور دوستوں پر جان دینے والے تھے۔

جہاں تک گھریلو زندگی کا تعلق ہے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ

کڑی کمان کے میاں تھے یا نرم مزاج کے۔ کبھی وہ بالکل معمولی سی بات پر بگڑ جاتے اور کبھی بڑی سی بڑی بات پر دھیان نہ دیتے۔ چائے کے بڑے شوقین تھے لیکن چائے کا گرم ہونا اور شکر کا کم ہونا ضروری سمجھتے تھے اور اگر اتفاق سے کوئی ٹھنڈی چائے سامنے رکھ دیتا تو پیالی اٹھا کر پھینک دیتے بیوی کو گھر کا مالک سمجھتے تھے اور بڑی پابندی سے پوری تنخواہ لاکر ان کے ہاتھ میں رکھ دیتے تھے ساتھ ہی ساتھ سوائے بیماری علاج کے سارا کام بیوی پر چھوڑ دیتے تھے یہاں تک اپنے لیے کپڑے کی خریداری کا کام بھی بیوی کا فرض سمجھتے تھے جس کی وجہ سے کبھی کبھی میاں بیوی میں چیخ چیخ بھی ہو جاتی تھی اور روٹھے میاں کو منانے کے لیے ہمیں بلایا جاتا۔

گھریلو کاموں سے انھیں کوئی لگاؤ نہیں تھا حتیٰ کہ وہ اپنے پائجامے میں ازار بند بھی نہ ڈال سکتے تھے اسی لیے جب ان کی بیگم کسی کام سے فتحپور چلی جائیں تو ان کا موڈ خراب رہتا۔ ایک دن دفتر آئے میں کام کر رہا تھا آکر پاس کھڑے ہو گئے اور کہا آپ کی بھتیجی صاحبہ تین دن کے لیے میکے گئی تھیں اور ہفتہ پورا ہو رہا ہے نہ خود تشریف لائیں اور نہ کوئی اطلاع دی کہ کب تک آئیں گی۔

میں نے کہا آپ کو کیا پریشانی ہے آپ کو ناشتہ کھانا بے فرشتے مل رہا ہے پرانا نوکر ہے اس کی نہ آپ کو نگرانی کی ضرورت

ہے اور نہ اسے کچھ بتانے کی تو پھر آپ کیوں ہٹ کے جا رہے ہیں۔ کہنے لگے اگر نوکر ہی سے گھر کا کام چل جاتا تو پھر لوگ شادی کیوں کرتے اپنی بھتیجی کو بلوا لیے ورنہ میں کوئی دوسرا انتظام کروں میں نے کہا نمک سے نمک نہیں کھایا جاتا وہ بھی قدوائی ہے غرض انھیں چند دن بھی بیوی بچوں سے الگ رہنا شاق گذرتا۔

وہ برتھ کنٹرول کے بڑے قائل تھے۔ ایک بچی کے بعد دوسری بچی ہوئی تو انھوں نے اپنی نس بندی کا ارادہ ظاہر کیا لیکن شاید ان کی بیگم نے آئندہ لڑکے کی امید میں اسے پسند نہ کیا بات ٹل گئی اس درمیان دو بچیاں اور پیدا ہو گئیں اس کے بعد وہ کسی سے کچھ کہے بغیر بلرام پور اسپتال جا کر نس بندی کرا آئے قدوائی پردے کے بڑے مخالف تھے ہماری بیوی پردے کی پابند ہیں ایک دن آئے ہم لوگ کمرے میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ بیگم باورچی خانے میں چائے کا انتظام کرنے لگیں۔ وہ بولے بھابھی کہاں ہیں میں نے کہا باورچی خانے میں یہ اٹھے اور باورچی خانے میں جا کر کہا بھابھی آداب عرض وہ انھیں دیکھ کر سٹپٹا گئیں مگر کرتیں کیا۔ محمد حسن نے کہا بھابھی ہم باورچی خانے ہی میں آپ کے ساتھ چائے پئیں گے جب سے پردہ ختم ہو گیا۔

بیماری محمد حسن نے پوری زندگی مردانہ وار بیماریوں کا مقابلہ کیا ان کے علاوہ اگر کوئی دوسرا ہوتا۔ تو شاید وہ

سال کی عمر میں مرنے کے بجائے چالیس ہی سال میں مرجاتا ہے انھیں اکوتے کی طرح کا مرض تو اس وقت سے شروع ہو گیا تھا۔

جب یہ ہمارے ساتھ جبلی کالج میں تھے اور اوکوتا تھا بھی کہاں داڑھی میں جس کی وجہ سے انھیں داڑھی بنانے میں بڑی پریشانی ہوتی تھی اچھے خاصے خوبصورت آدمی تھے کھلتا گیہواں رنگ بڑی بڑی آنکھیں ستواں ناک پتلے ہونٹ کشادہ پیشانی چوڑا سینہ میانہ قد مگر ظالم اوکوتا خوبصورت چہرے کو داغدار کئے رہتا اس موذی مرض سے آخر دم تک پیچھا نہ چھوٹا۔ داڑھی میں کم ہو گیا لیکن بغلوں میں باقی رہا۔

اس کے علاوہ ان کے دونوں پھیپھڑے خراب تھے کبھی کبھی بخار بھی آجاتا تھا لیکن اپنی ہمت دوا علاج میں مستعدی اور کھانے پینے میں چوکسی سے وہ زندگی کی ۵۸ منزلیں طے کر گئے دوائیں کھاتے رہتے ساتھ ہی ساتھ کھانے پینے کا بھی کافی خیال رکھتے وہ دودھ اور انڈے کا استعمال برابر جاری رکھتے ایک مرتبہ کہیں باہر ہو گئے تھے اور سیدھے دفتر چلے آرہے تھے تو میں نے دیکھا کہ انھوں نے انڈے منگوائے اور توڑ کر کھا گئے۔ ان کے گھر والے بھی ان کے کھانے پینے اور ان کی آرام کا بڑا خیال رکھتے۔ پھیپھڑوں میں خرابی سے سانس پھولنے کی شکایت ہو گئی تھی آخر میں سانس پھولنے کے

دورے جلد جلد پڑنے لگے ۱۹۸۰ء کے آخر میں کئی بار اسپتال میں داخل ہونا پڑا۔ جب میں بلرام پور اسپتال میں دیکھنے گیا تو سانس پھولنا کم ہو گیا تھا اور وہ لیٹے اخبار پڑھ رہے تھے مجھے دیکھا تو اٹھ کر بیٹھ گئے ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں میں نے کہا اب تو طبیعت ٹھیک معلوم ہوتی ہے کب تک دفتر جانا شروع کرو گے کہنے لگے میری چھٹیاں بالکل باقی نہیں رہی ہیں جلد سے جلد دفتر جانا چاہتا ہوں مگر کسے معلوم تھا کہ اب وہ کبھی دفتر نہ جا پائیں گے اسپتال میں ایک دن ان کے منھ سے بہت خون آگیا اور وہ ہمیشہ کے لیے ہم لوگوں سے جدا ہو گئے جب مجھے معلوم ہوا تو میں سکتے کے عالم میں ہو گیا اور سیدھا اسپتال پہونچا وہاں معلوم ہوا کہ ابھی لاش گھر گئی ہے۔ گھر گیا تو کہرام مچا تھا میں نے اپنے عزیز ترین دوست کے آخری دیدار کے لیے چادر اٹھا کر منہ دیکھا اور سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

بھائی محمد حسن عام طور پر کچھ نہ کچھ سوچا ہی کرتے تھے اور غنیے میں رہتے تھے میرا ان کا کافی ساتھ رہا ہے غنیے کے عالم میں رہنے کی بنا پر ان سے متعلق مجھے کافی دلچسپ واقعات کا علم ہے اگر ان واقعات کا مختصر طور پر ذکر کر دیا جائے تو ان کی پوری شخصیت سامنے آجائے گی میں انھیں ان کی اس خصوصیت کی وجہ سے غنا بھائی کہا کرتا تھا۔

ایک مرتبہ غنّا بھائی فتحپور بارہ بنکی جانے کے لیے گھر سے ناشتہ وغیرہ کر کے بس اسٹیشن قیصر باغ آئے اور اپنے نزدیک وہ فتحپور جانے والی بس پر بیٹھ گئے اور ٹوکری سے اخبار نکال کر پڑھنے لگے اس کے بعد دو مسافر آئے اور ان کے پیچھے والی سیٹ پر بیٹھ گئے اور آپس میں باتیں کرنے لگے کہ ہم لوگ سیتاپور پہونچ کر جلدی کام نپٹالیں تاکہ آج ہی لکھیم پور پہونچ جائیں غنا بھائی کے کان میں سیتاپور جانے کی بات آئی تو انھوں نے مڑکر ان مسافروں سے کہا آپ اس بس سے اتر جائیے یہ بس فتح پور جارہی ہے اس کے بعد پھر اخبار پڑھنے لگے۔

مسافروں نے جب ان کی بات سنی تو انھیں غنا بھائی کے اس اعتماد پر ہنسی آگئی کہ وہ ان سے کہہ رہے ہیں کہ آپ لوگ غلط بس پر بیٹھ گئے ہیں اتر جائیے حالانکہ وہ خود وہ غلط بس پر بیٹھ گئے ہیں بس روانہ ہوگئی اور غنا بھائی مزے میں اخبار پڑھتے اور فتح پور پہونچنے کا خواب دیکھتے رہے۔ بس آگے بڑھ کر موتی محل پل کی طرف جانے کے بجائے ڈالی گنج والے پل کی طرف بڑھی لیکن وہ بدستور اخبار پڑھتے رہے اور وہ دونوں مسافر انھیں دیکھ دیکھ کر مسکراتے رہے لیکن جب بس پکا پل پاس کرنے لگی تو انھیں غنا بھائی کی خود فراموشی پر رحم آیا اور انھوں نے کنڈکٹر سے پکار کر کہا بھائی گاڑی روک کر آپ کو اتار دو

آپ فتحپور جاتے والے ہیں۔
اب غنا بھائی یکدم چونکے اور جب انھوں نے بس کو پکا پل پار کرتے دیکھا تو گھبرائے اتنے میں بس رک گئی اور یہ مسافروں کی طرف دیکھے بغیر چپکے سے اتر پڑے اور رکشا کر کے قیصر باغ بس اسٹیشن واپس آ گئے۔

ہم لوگوں کے جبلی کالج کے ساتھی رستوگی صاحب سے محمد حسن کے کافی تعلقات تھے بات یہ تھی کہ انھیں بھی اسکیمیں بنانے کا بڑا شوق تھا اپنے آبائی کاروبار کے ساتھ ساتھ کاشتکاری سے بھی دلچسپی رکھتے تھے انھوں نے قصبہ دلیا میں ایک بڑی زمین کاشتکاری کے لیے لا رکھی اردو زبان سے وہ اچھی طرح واقف تھے کچھ دنوں تک انھوں نے قومی آواز میں بھی کام کیا تھا شاعری بھی کرتے تھے کبھی کبھی ہمارے یہاں بھی چلے آتے تھے اور اپنا کلام سناتے تھے اچھا خاصا کہہ لیتے تھے زبان بڑی صاف ستھری تھی وہ محمد حسن کے یہاں اکثر آیا کرتے تھے۔ ایک دن آپ تو نہیں معلوم کس مسئلے پر بحث چھڑ گئی وہ جب واپس جانے لگے تو محمد حسن ان کو رخصت کرنے کے لیے ساتھ چلے راستے میں بحث جاری رہی یہاں تک قیصر باغ بس اسٹیشن سے جہاں محمد حسن کا مکان تھا۔ مولوی گنج تک محمد حسن پہونچ گئے یہاں محمد حسن کے ایک جاننے والے مل گئے اس طرح بحث کا سلسلہ ختم ہو گیا اور رستوگی صاحب کے ساتھ اپنے گھر چلے گئے

محمد حسن جب لوٹے تو مولوی گنج کے ایک ہوٹل میں جو مسجد خواص کے پاس تھا۔ چائے پینے بیٹھ گئے چائے پیتے پیتے غنے میں آ گئے اور جب ہوٹل سے نکلے تو امین آباد کی طرف آنے کے بجائے رکاب گنج کی طرف مڑ گئے جب پل کے پاس پہونچے تو چونک کر بولے امین آباد کے راستے میں یہ پل کیسا اور اپنی بھول پر مسکراتے ہوئے واپس ہو گئے۔

ایک دلچسپ قصہ سن لیجئے محمد حسن جب قندھاری بازار میں رہتے تھے تو اپنے دوست ڈاکٹر سالومن کا علاج کرتے تھے ایک مرتبہ ڈاکٹر صاحب نے قارورہ دکھانے کو کہا انھوں نے پیشاب کر کے قارورہ کی شیشی پاخانے میں رکھ دی مہترانی آئی تو دھکا لگ جانے سے شیشی لڑھک گئی اور پیشاب گر گیا۔

مہترانی نے سوچا یہ تو بڑا برا ہوا قدوائی صاحب خفا ہوں گے اس نے قارورے کی خالی شیشی میں پیشاب کر کے شیشی اسی طرح رکھ دی جس طرح رکھی تھی محمد حسن نے جب قارورہ ڈاکٹر سالومن کو دکھایا تو وہ بہت چکرائے اور انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا قدوائی صاحب آپ کو تو حمل ہے۔

محمد حسن میں یہ خاص بات تھی کہ وہ جس کام کو کرنے کا ارادہ کر لیتے تو پھر کسی کے کہنے سننے سے ٹس سے مس نہ ہوتے چنانچہ انھوں

نے ایک مرتبہ قندھاری بازار سے کارپوریشن کا الیکشن لڑنے کا ارادہ کر لیا تو وہ ہمارے جیسے عاقبت اندیش لوگوں کے روکنے سے اپنے ارادے سے ہٹے نہیں اور نتیجے کی پرواہ کیے بغیر الیکشن لڑے مقابلہ ان کے دوست ڈاکٹر سالومن سے تھا اس حلقے میں سالومن صاحب کا بڑا اثر تھا۔ سالومن صاحب جیت گئے محمد حسن بڑی خندہ پیشانی سے انھیں مبارک باد دینے گئے۔

محمد حسن صحافت کی چکی چلانے کے ساتھ ساتھ کاروبارِ عشق میں لگے رہتے انتقال کے بعد ان کی اہلیہ عزیزہ انیس نے مجھ سے کہا آپ قومی آواز جا کر ان کی میز میں جو چیزیں رکھی ہوں وہ نکال لائیے ان کی میز پر کچھ رسالے پڑے تھے اور میز کی دراز میں تصویر بتاں تو نہیں تھیں لیکن حسینوں کے خطوط ضرور تھے۔ جو میں نے انیس کو دینے کے بجائے پھاڑ کر پھینک دیئے۔ اور محمد حسن کی گوناگوں مصروفیتوں کی یاد دل میں لیے واپس آیا۔

شامتِ اعمال ایک مرتبہ ہمیں اور انھیں ساتھ ساتھ ایک جگہ جانا تھا۔ طے یہ ہوا تھا کہ ہم آٹھ بجے صبح ان کے یہاں پہنچ جائیں وہ ہمیں تیار ملیں گے وہاں سے ہم دونوں اسٹیشن چلے جائیں گے۔

ہمیں معلوم تھا کہ غنا بھائی لیٹ لطیف ہیں اس لیے ہم نے ان سے گاڑی کی روانگی کا ٹائم دس بجے بتایا ورنہ دراصل گاڑی

گیارہ بجے جاتی تھی گھر سے روانہ ہونے میں مجھے کچھ دیر ہوگئی اور میں محمد حسن کے یہاں نو بجے پہونچا میرا خیال تھا کہ وہ تیار کھڑے مجھ پر بگڑ رہے ہوں گے اور کہہ رہے ہوں گے کہ لیٹ لطیف میں ہوں کہ تم مگر جب ہی ان کے گھر کے اندر گیا تو وہ بگڑنے کے بجائے لیٹے خراٹے لے رہے تھے میں نے لپک کر وہ چادر گھسیٹ لی جسے وہ سر سے پاؤں تک تانے سو رہے تھے چادر کھنچتے ہی وہ چونک پڑے اور بولے یہ کیا حرکت ہے میں کہا گاڑی سیٹی دے رہی ہے اور آپ ابھی تک مزے میں سو رہے ہیں گاڑی کی سیٹی کی بات سن کر وہ ہڑبڑا کر اٹھ پڑے اور ضروریات سے فارغ ہونے کے بعد جلدی جلدی منہ دھونے لگے اور تھوڑی دیر بعد تیار ہو گئے چائے میز پر لگائی گئی اور انھوں نے چائے پینا شروع کیا۔ چائے پیتے پیتے غصے میں آگئے اور ایک پیالی کے بعد دوسری اور پھر تیسری میں چائے انڈیلنے لگے اب مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے کیتلی ہاتھ سے چھین لی۔

انھوں نے بیگم سے پان کی فرمائش کی پان پہلے سے بنا رکھا تھا۔ پان اٹھا کر منہ میں رکھا اور بیڑی سلگانے کے لیے دیا سلائی ڈھونڈنے لگے۔ پہلے کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈالا پھر لپک کر شیروانی کی جیب ٹٹولی مگر دیا سلائی ملتی کیسے وہ تو سرہانے تکیہ کے نیچے رکھی تھی۔ بگڑ کر بولے ہزار مرتبہ کہہ دیا کہ ہماری

دیا سلائی کوئی اٹھایا نہ کرے بیگم نے کہا آپ کی دیا سلائی کسی نے نہیں اٹھائی اور پھر اٹھ کر ان کے تکیہ کے نیچے سے دیا سلائی نکال کر دیدی اور مسکرا کر کہا بغل میں لڑکا شہر ڈھنڈھورا لیکن انکی بغل میں لڑکے کے بجائے میں کھڑا تھا میں نے کہا ڈھونڈنے سے چاہیے لڑکا مل جائے مگر گاڑی نہیں ملے گی۔ چنانچہ یہی ہوا جب ہم لوگ ستی اسٹیشن پہونچے تو گاڑی نکل چکی تھی پٹری چمک رہی تھی۔

صبح انھیں بارہ بنکی جانا تھا۔ رات کو اس ارادے سے لیٹے کہ جلدی اٹھ جائیں گے اور سویرے والی بس سے ٹھیک وقت پر وہاں پہونچ جائیں گے لیکن جب چارپائی پر لیٹے تو بند مینا نہ انگ چینا والی کیفیت تھی۔ نیند غائب تھی۔ بدن ٹوٹ رہا تھا بارہ گھنٹوں کے اندر آدھا درجن سے زائد چائے کی پیالیاں نوش فرما چکے تھے۔

نیند کے نخرے کسی معشوق کے نخروں سے کم نہیں ہوتے اسے بلائے تو وہ تھرک کر دور چلی جاتی ہے ہمارے غنّا بھائی کوئی اناڑی آدمی نہیں تھوڑی سی عمر میں ایک شادی اور کئی معاشقے کر چکے ہیں اس لیے معشوقوں کے مزاج سے اچھی طرح واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ معشوق تا بے وفا اور اچٹ جانے والی نیند کا انتظار نہیں کرنا چاہیئے۔ انتظار کرنے سے وہ قریب آنے کے بجائے دور بھاگتی ہے چنانچہ انھوں نے اس کا کوئی انتظار نہیں کیا بلکہ اس کو چڑھانے کے لیے شلف سے نکال کر ایک ناول پڑھنے لگے تھوڑی دیر تک نیند تیوریوں پر بل

ڈالے الگ کھڑی رہی لیکن جب اس نے دیکھا کہ ناول اس کی سوکن بن کر آنکھوں پر قبضہ کیے چلی جا رہی ہے تو اس نے آنکھ بچا کر آنکھوں میں آنے کی کوشش کی اس نے بہت سے سہلائے پلکوں سے جھانکی نیند کا تیر آنکھوں میں انڈیلا کہ جتن کیے لیکن غنا بھائی پر ناول کا ایسا نشہ سوار تھا کہ انھوں نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا اور ناول سینے پر رکھ کر آنکھوں سے لگائے رکھا جھپکی آئی لیکن انھوں نے آنکھیں مل کر نیند کو باہر نکال دیا۔

ناول ابھی آدھا بھی نہیں ہوا تھا۔ کہ تارے جھلملانے اور بجھے کنمنانے لگے تھوڑی دیر بعد ان کی بیگم صاحبہ نے انگڑائی لی اور کہا کیا اب دن کو بھی بجلی جلائی جائے گی غنا بھائی بیگم صاحبہ کی آواز سن کر بولے بجلی میں نے نہیں جلائی جب میں لیٹا تو بجلی جل رہی تھی۔ یہ سن کر وہ اور بلبلا گئیں اور بولیں یہ کہیئے کہ بجلی رات بھر بے کار جلتی رہی وہ ناول پر آنکھیں جمائے ہوئے دھیرے سے بولے بے کار نہیں جلتی رہی یہ جواب سن کر ان کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور انھوں نے کہا کہ اگر اسی طرح رات رات بھر ناول بازی ہوتی رہی تو ساری تنخواہ بجلی ہی کی نذر ہو جائے گی غنا بھائی یہ سن کر سٹپٹا گئے اور بولے میں نے سوچا صبح ضروری کام سے بارہ بجے جانا ہے سو گیا تو تم کہو گی کہ کبھی کوئی کام وقت سے نہیں کرتے وہ جھنجھلا کر بولیں واقعی آپ کو وقت کا بڑا خیال ہے۔ بس بارہ بجے

چھ بجے جاتی ہے اور اس وقت سوا چھ بج رہے ہیں اور آپ ابھی تک ناول بازی فرمار ہے ہیں۔

غنا بھائی یہ سنتے ہی چھلانگ مار کر چارپائی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے بس بیس آپ کی طرح ہر وقت گھڑی نہیں دیکھا کرتیں دس بیس منٹ کا ہیر پھیر تو ہوتا ہی رہتا ہے بس ایک پیالی چائے دو۔ اور میں چلا اس کے بعد انھوں نے پھر ناول آنکھوں سے لگا لی۔ چائے میز پر رکھی رہی اور اس کی بھاپ اڑا اڑ کر انھیں چونکانے کی کوشش کرتی رہی لیکن ان کے کان پر جوں تک نہ رینگی اور جب انھوں نے ناول کا آخری ورق الٹا تو چائے سرد آہیں بھر کر مایوس ہو چکی تھی۔ اور جس بس پر انھیں بارہ بنکی جانا تھا وہ ان کے بغیر بارہ بنکی پہونچ چکی تھی۔

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ خواتین تیاری میں اتنی دیر لگاتی ہیں کہ گاڑی چھوٹ جاتی ہے لیکن ہم نے کچھ مرد بھی ایسے دیکھے ہیں کہ ان کی تیاری بڑی صبر آزما ہوتی ہے۔ ہمارے دوست محمد حسن قدوائی اپنے ساتھیوں میں لیٹ لطیف مشہور تھے انھیں بھی تیاری میں اتنی دیر ہو جاتی تھی کہ پچیس تیس سال کی سروس میں وہ ایک دن بھی وقت سے دفتر نہیں پہونچے مگر اس کے ساتھ یہ بات بھی تھی کہ انھوں نے واپسی میں بھی کبھی

جلدی نہیں کی چاہیے پانچ کے چھ بج جائیں جب تک کام پورا نہ کر لیتے سر نہ اٹھاتے۔

دفتروں میں عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ آئیں چاہے جتنی دیر میں لیکن ساڑھے چار بجے سے ہی کام کرنے کے بجائے گھڑی دیکھنے لگتے ہیں اور سوئی جیسے ہی پانچ پر پہونچا اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کسی دفتر میں جائیے تو ساڑھے دس بجے تک تو بالکل سناٹا رہتا ہے اسی طرح اگر آپ کسی سرکاری دفتر کی طرف سوا پانچ بجے جائیے تو وہاں الو بولتا معلوم ہوتا ہے

ایک مرتبہ مجھے اور محمد حسن کو صبح آٹھ بجے کہیں جانا تھا راستہ انھیں کے مکان کی طرف سے تھا طے یہ ہوا کہ میں ان کے یہاں ساڑھے سات بجے پہونچ جاؤں وہ تیار کھڑے ملیں گے جب ہم ان کے یہاں ساڑھے سات بجے پہونچے تو وہ چادر تانے سو رہے تھے ان کی بیگم نے جگایا اور کہا جلدی سے تیار ہو جائیے اور وہ نہایت تیزی سے اٹھے اور لوٹا لے کر دفع حاجت کے لیے چلے گئے وہ گئے تو بڑی تیزی سے تھے لیکن واپسی قیامت ہو گئی جب میں نے بہت شور غل مچایا تو نکلے اور کہا بس دو منٹ میں تیار ہوا جاتا ہوں جب تک تم چائے پیو اس کے بعد انھوں نے برش لے کر دانتوں

کی صفائی شروع کی میں چائے پی بھی چکا اور وہ دانت ہی صاف کرتے رہے ۔ میں نے کہا اللہ خیر کرے ابھی تو آپ دانت ہی صاف کرتے رہے ۔ میں نے کہا منہ دھونے میں تو قیامت آجائے گی ایک سکے بعد وہ برش رکھ کر کلیاں کرنے لگے آپ کو یقین نہ آئے گا بلا مبالغہ جب وہ ایک درجن کلیاں کر چکے تو میرے صبر کا جام لبریز ہو گیا اور میں نے گھڑا اٹھا کر اپنے پاس رکھ دیا اور کہا کہ لوٹے کا پانی تو ختم ہو رہا ہے اب مزے میں گھڑے کے پانی سے جتنی کلیاں چاہے کرو تب وہ چونکے اور انھوں نے جلدی جلدی منہ پر پانی ڈالنا شروع کیا غرض ساڑھے آٹھ بج گئے اور منہ دھوتے ہی رہے ۔

اس کے بعد میں نے کہا آپ اطمینان سے منہ دھوتے ہیں چلا مگر میرے تنہا جانے سے کام نہیں بن سکتا تھا اس لیے میں صرف جانے کی دھمکی دے کر رہ گیا ۔ اتنے میں ان کی بیگم نے ناشتہ لا کر میز پر رکھ دیا اور کہا اٹھئے ناشتہ کر لیجئے ورنہ چائے ٹھنڈی ہو جائے گی وہ زہر پی سکتے تھے لیکن ٹھنڈی چائے نہیں پی سکتے تھے اس لیے وہ جلدی سے ناشتہ کرنے میز کے پاس آگئے ۔ قصہ مختصر کپڑے بدلنے اور جوتا پہننے میں اتنی دیر ہو گئی کہ وہاں جانے کا پروگرام بدلنا پڑا میں نے ان کی بیگم سے کہا کہ کل تم ان کا منہ دھلا کر اور کپڑے پہنا کر تیار رکھنا میں آؤں گا ان کو انگلی پکڑ کر لے جاؤں گا ۔

وہ حسب دستور سو رہے تھے ان کی بیگم ان کے کمرے میں گئیں اور

کہا اٹھئے تنو کو ڈاکٹر کے یہاں لے جانا ہے اس کو رات میں اتنا بخار تھا کہ بالکل تھن رہی تھی پنڈے پر ہاتھ رکھنا مشکل تھا۔ رات بھر آؤ باؤ بکتی رہی صبح کے وقت ذرا آنکھ لگ گئی ہے۔ تنو کو بخار تھا لیکن اتنا بھی نہیں تھا جتنا ان کی بیگم نے بتایا تھا انھوں نے شاید بڑھا چڑھا کر اس لیے بتایا تھا کہ محمد حسن جلدی سے اٹھ جائیں ان میں یہ بات تھی کہ وہ اپنے بچوں پر جان چھڑکتے تھے۔ وہ جلدی سے اٹھے اور سیدھے تنو کے پاس گئے اور ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بخار دیکھا اور مسکرا کر بولے بخار تنو کے نہیں تمہارے ہے۔ کہ صبح ہی صبح سر پر سوار ہو گئیں اسے معمولی حرارت سی ہے موسم بدل رہا ہے آج کل تو تھوڑا بہت بخار ہو ہی جاتا ہے تم ناشتہ لگاؤ میں ابھی تیار ہو کر فوراً آ رہا ہوں یہ سن کر ان کی بیگم مسکرائیں اور کہا دس بجے تک تیار ہی ہو جائے تو غنیمت ہے ایک مرتبہ وہ حسب معمول آستین چڑھائے کام میں جٹے ہوئے تھے لنچ کا وقت آیا اور ہم لوگ کھانے کے لیے چلے گئے۔ کھانے کی میز پر سب کے ناشتے دان رکھے ہوئے تھے ہم لوگوں نے شرارت میں ان کا ناشتہ دان کھول کر جو کچھ اس میں تھا کھا لیا اور ناشتے دان کے برتن اس طرح کھول کر میز پر رکھ دیے کہ جیسے وہ کھانا کھا کر اور برتن چھوڑ کر گئے ہیں تین بجے کے قریب وہ چونکے اور کھانا کھانے کی میز کے پاس گئے تو ناشتے کے ڈبے کھلے

ہوئے۔

ہوئے رکھے دیکھ کر یہ سمجھے کہ وہ کھانا کھا چکے ہیں اور چپکے سے وہاں سے واپس آکر کرسی پر بیٹھ گئے اور پھر کام کرنے لگے ہم لوگ ان کی خود فراموشی کا لطف لیتے اور مسکراتے رہے لیکن بعد کو ہم لوگوں کو ان پر رحم آیا اور ہم نے چپراسی کو بلا کر ان کے لیے توس مکھن اور چائے منگوائی۔ مکھن توس کھانے کے بعد وہ بولے یہ دعوت کس خوشی میں دی گئی ہے اب ہم لوگ ہنسی روک نہ سکے اور کہا کہ آپ نے کبھی تو بڑا ایثار کیا اور اپنا کھانا ہم لوگوں کو کھلا دیا اور خود بھوکے کام کرتے رہے۔ یہ سن کر وہ اپنی بھول اور ہم لوگوں کی شرارت سے کافی محظوظ ہوئے۔

غنا بھائی میں بھول کے علاوہ ایک اور کمزوری تھی جو تھوڑی بہت سب لوگوں کو ہوتی ہے یعنی وہ سب کچھ بھول سکتے تھے لیکن کسی حسین چیز کو دیکھنا نہیں بھول سکتے تھے ان کا یہ ندیدہ پن ان کی بیگم کو برا لگتا تھا۔ مگر کچھ کہتی نہیں تھیں ایک مرتبہ بیگم صاحبہ بیمار پڑیں وہ اپنی بیگم صاحبہ کو بہت چاہتے تھے انھیں چھینک بھی آجائے تو پریشان ہو جاتے تھے اور اچھے سے اچھے ڈاکٹر کو بلا کر دکھاتے تھے۔ وہ اپنی بیگم صاحبہ کو دکھانے کے لیے ڈاکٹر کے یہاں پہونچے حسن اتفاق کہیے یا سوئے اتفاق ڈاکٹر کے یہاں کی نرس صورت

شکل کی اچھی تھی اسے دیکھ کر بیگم کا ماتھا ٹھنکا اور جب وہ ڈاکٹر کو دکھانے اندر گئیں تو کچھ بے چین سی تھیں ڈاکٹر نے پوچھا آپ کو کس بات کی فکر ہے انھوں نے کہا کچھ نہیں آپ نرس کو اندر بلا لیجئے ڈاکٹر مسکرائے اور کہا کیا آپ کو مجھ پر بھروسہ نہیں وہ بولیں آپ پر تو بھروسہ ہے لیکن ان پر یعنی اپنے میاں پر بھروسہ نہیں وہ نرس کے پاس باہر بیٹھے ہیں ان کی یہ بات سن کر ڈاکٹر مسکرایا وہ انھیں دیکھ تو چکا ہی تھا۔ اس نے ان کے شوہر محمد حسن کو اندر بلا لیا اور ان سے کہا کہ آپ کی بیگم کو کوئی خاص بیماری نہیں ہے آپ یہ نسخہ انھیں استعمال کرائے اور آپ تھوڑا سا پرہیز کیجئے۔

یہ سن کر محمد حسن چکرائے اور انھوں نے کہا کہ بیمار بیگم ہیں اور پرہیز کرنے کو آپ مجھ سے کہہ رہے ہیں ڈاکٹر مسکرایا اور اس نے کہا کہ آپ کی بیگم کا اختلاج اس وقت تک دور نہیں ہو سکتا جب تک آپ حسینوں کی طرف دیکھنے سے پرہیز نہیں کریں گے۔ محمد حسن ڈاکٹر سے کچھ پوچھنا چاہتے تھے لیکن ان کی بیگم ان کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل آئیں اور کہا گھر جلد چلئے بچے اکیلے ہیں۔

جب ان کی شادی ہوئی اور وہ چوتھی جانے لگے تو میں نے کہا دیکھو بھائی بارہ بنکی میں چوتھی میں بڑا مذاق کیا جاتا

سے ذرا سمجھ بوجھ کر کھانا۔ چونکہ میں بھی ساتھ تھا شروع میں تو یہ کچھ چوکنا رہے لیکن پھر غفلے میں آگئے اور سامنے پلیٹ میں رکھے لڈو جو نیم کی کھلی کے بنے تھے اٹھا کر منہ میں رکھ لیے خواتین چق کے پیچھے سے جھانک رہی تھیں ان میں کھسر پھسر ہونے لگی۔ غنا بھائی کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا اور انھوں نے منہ بنانے کے بجائے نیم کی کھلی کے کڑوے لڈو اس طرح مزا لے لے کر کھانے لگے جیسے کہ سندیلے کے لڈو کھا رہے ہوں اور خواتین تعجب کرتی رہ گئیں۔



چودھری شرافت

چودھری شرافت نے اپنے بڑے بھیا کی شادی کے موقعہ پر بنگاڑپور کے گاؤں میں اپنی زمینداری کا ایک حصہ بیچ ڈالا اور شادی کے سلسلے میں ایسے اہتمام کئے کہ سارے جوار میں برسوں تک اس کا چرچا رہا۔ ہڈی سے ہڈی ملانے کی غرض سے شادی قریب ہی ایک گاؤں میں اپنے کنبے ہی کے ایک گھرانے میں کی اگرچہ لڑکی والے چودھری صاحب کے پلے کے زمیندار تو نہ تھے لیکن بیٹی داروں میں ان کی جوڑ کا جوار میں کوئی نہ تھا۔ ایک ہی لڑکی تھی۔ وہ بھی حوصلہ نکالنا چاہتے تھے اور بڑی برات کی مانگ کی تھی چودھری صاحب کے یہاں براتیوں کی کیا کمی تھی۔ ہاتھی گھوڑے رتھ، بہلو، ادھے اور گاڑیوں کی قطار دولہا کی چوپال سے لے کر دولہن کی چوکھٹ تک لگی ہوئی تھی۔

رات کی تاریکی میں گیس اور مشعلوں کی حرکت کرتی ہوئی لمبی لائن

دور سے ایسی معلوم ہوتی جیسے کوئی فوج گڑھی پر حملہ کرنے کے لیے بڑھ رہی ہو۔

چودھری صاحب نے شادی کے موقع پر سبھی گھر والوں اور نوکروں چاکروں کے جوڑے بنوائے تھے اور اسی سلسلہ میں نومبر کے مہینے میں لکھنؤ آکر ایک بڑے "کالاتھ مرچنٹ" کی دکان پر یہ شیروانی کا کپڑا ابھی تھان سے نکلوایا اور یہاں کے شیروانی سینے والے مشہور و معروف درزی سے شیروانی اپنے جسم کے سانچے میں ڈھلوا کر اپنے ساتھ لے گئے۔ اس دن سے آخری سانس تک اس شیروانی کا ساتھ نہ چھوڑا۔ چودھری الٰہی پر بڑھاپے میں مبتلا ہو کر اللہ کو پیارے ہو گئیں۔ بڑے بھیا نے بال بچے والے ہو کر الگ گھر بسا لیا۔ زمینداری ختم ہو گئی اور اس کے خاتمے کے ساتھ نوکر چاکر بھی لوپ ہو گئے۔ مگر شیروانی کا ساتھ آخر دم تک رہا۔

چودھری صاحب نے پہلے سال تو شیروانی ایسے دلار پیار سے رکھی کہ کسی نئی نویلی دلہن کا کیا ہوتا ہوگا۔ چودھری صاحب اپنے سامنے بڑی احتیاط سے کپڑے میں لپٹوا کر اپنے بڑے بکس میں رکھواتے خاص ہی خاص موقعوں پر اس کو مانجھے سے نکالا جاتا۔ جہاں اسے دلہن بنا کر رکھا جاتا تھا۔ اس کے نرم اور نازک جسم کو کیڑے مکوڑے کی دست درازی سے بچانے کے لیے فنائل کی گولیوں اور نیم کی پتی کی نگرانی میں آرام دیا جاتا لیکن

بدقسمتی سے وہ لکھنؤ میں پیدا ہوئی تھی جہاں تیز خوشبو سے بیگمات کو چھینکیں آنے لگتیں فنائل کی گولیاں اس کی زندگی اجیرن کیے ہوئے تھیں۔ سانس لینا محال تھا ناک بند کیے کیے اس کا دم گھٹنے لگتا اور ڈپٹی صاحب کے دورے اور تھانیدار صاحب کی آمد پر ہی اسے اس کال کوٹھری سے کچھ دیر کے لیے بڑے بکس سے رہائی ملتی اس کے بعد پھر وہی کنج قفس پھر وہی "فولاد" کا گھر

جب چودھری صاحب مقدمہ کی پیشی پر جانے کے لیے تیار ہوتے تو اسے بھی بڑے اہتمام سے بڑے بکس سے نکال لیتے اور جب وہ اسے پہن کر کھڑے ہوتے تو سیر و خود کاشت کی طرح بچا کھچا ان کا پرانا نوکر لفاتی برش لے کر پھر اس طرح برش پھیرنے لگتا جیسے وہ اگلے وقتوں میں چودھری صاحب کی کالی گھوڑی کے کھریرا کیا کرتا تھا۔ اس کے بعد چودھری صاحب آئینے کے سامنے گردن گرٹی کر کے یوں کالر ٹھیک کرتے جیسے معلوم ہوتا کہ ان کی گئی جائداد اور بیتی جوانی دونوں ساتھ واپس آگئیں اور پھر چودھری صاحب کا ہاتھ بے ارادہ مونچھوں پر پہونچ جاتا۔ لیکن تاؤ دیئے بغیر وہ ٹھنڈی سانس بھر کر کمرے سے باہر چلے جاتے جہاں ایک چھپر کے نیچے کھڑی ان کی ٹوٹی ٹم ٹم ان سے معذرت کرتی ہوئی بغل میں کھڑے ہوئے ادھے پر سوار ہو کر اسٹیشن جانے کا اس طرح مشورہ دیتی معلوم

ہوتی جیسے پہلے چودھرائن چادر کے مطابق پیر پھیلانے کا مشورہ دیا کرتی تھیں۔

باہر آ کر چودھری صاحب جب ادھے پر سوار ہونے لگتے تو وہ شیروانی کے دامن سمیٹ کر جیبوں میں کر لیتے کہ کہیں ادھے کے پہیوں کی مٹی لگ کر انھیں داغ دار نہ کر دے ادھے کے بیل چودھری صاحب نے ہمعصر ہونے کی بنا پر نہایت بے تکلفی سے اپنی دم ہلاتے اور مکھیوں کی گستاخی پر کان پھٹپھٹاتے زمانے کی تیز رفتاری کے خلاف بطور احتجاج سست رفتاری سے چلتے رہتے تھے اور چودھری صاحب بیتے دنوں کی یاد میں گم ہو جاتے تھے۔ اگر بیل کبھی ایک جانی پہچانی پگ ڈنڈی کی طرف مڑنے لگتے تو گاڑی بان انھیں سیدھے راستے پر لگا دیتا۔ اس پگڈنڈی کی طرف بے اختیار بیلوں کے مڑنے پر چودھری صاحب چونک کر ایک آہ سرد بھرتے کیوں کہ یہ پگ ڈنڈی ان کی جوانی کی ٹیڑھی لکیر کی طرح گھومتی ہوئی اس گاؤں میں جاتی تھی جہاں ان کا یہ ادھا جوانی میں اکثر چودھرائن کی لاعلمی میں منی بیگم کے مکان پر جاتا تھا۔ بوڑھے بیل پرانی پگ ڈنڈی کی طرف مڑنے کی غلطی کا احساس کرتے ہی تیزی سے اسٹیشن کی طرف بڑھنے لگتے اور چودھری صاحب اپنے دل کا بار کم کرنے کے لیے شیروانی کے جسم پر پڑی دھول جھاڑنے لگتے لیکن اسٹیشن پہونچنے تک نہ اس کے جسم کی دھول کم ہوئی اور

نہ ان کے دل کا غبار۔
شہر پہنچ کر وہ سیدھے وکیل صاحب کے یہاں جاتے تھے
چودھری صاحب کی عمر بھی بقول شخصے اسی دشت کی سیاحی میں
گزری تھی۔ وہ منشی جی کے اشارے کا مطلب فوراً سمجھ گئے اور باہر
آتے ہی انھوں نے جیب سے دو روپیے کا نوٹ نکال کر ان کے
حق سے پہلے ہی سبکدوش ہونے کے لیے ان کے ہاتھ پر رکھ
دیا پھر بے تکلفی سے منشی جی کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر راز
داری سے بولے کر وکیل صاحب کی پچھلی پیشی کی فیس کچہری میں
دوں گا۔ منشی جی اپنا حق تو پا ہی چکے تھے اس لیے وکیل صاحب
کی فیس کے متعلق خاموش رہ کر نیم رضا مندی کا اظہار کرنا ہی
مناسب خیال کیا اور چودھری صاحب بھی جواب کا انتظار
کیے بغیر جیبوں میں ہاتھ ڈال کر کمرے کی طرف کچھ سوچتے ہوئے
اس طرح بڑھے جیسے ان میں فیس کی رقم تلاش کر رہی ہوں۔
وکیل صاحب کو منشی جی کا مطمئن چہرہ دیکھ کر اپنی فیس کی طرف
سے بھی اطمینان ہو گیا۔ اور وہ دوسرے موکلوں سے مقدمہ
کے بارے میں بات چیت کرنے لگے۔
چودھری صاحب نے اپنی فائل منشی جی سے اپنے سامنے
الماری سے نکلوا کر آج کچہری جانے والی فائلوں میں رکھوا
دی اور اس طرف سے اطمینان کر کے کہ اب وکیل صاحب

پیشی پر پہونچنا نہ بھولیں گے۔ منشی جی سے رخصت ہو کر کچہری جانے کے لیے باہر آ ہی رہے تھے کہ منشی جی نے لپک کر بڑی رازداری سے کہا کہ "دیکھئے وکیل صاحب کی فیس کا خیال رکھیئے گا۔ پچھلی پیشی کی فیس تو آج ضرور ادا ہو جانی چاہیئے۔ ورنہ وکیل صاحب ہتھے سے اکھڑ جائیں گے۔ چودھری صاحب بولے "دیکھیے منشی جی آج کی پیشی گول نہ ہونے پائے، فیس کا انتظام تو میں شام تک کر ہی دوں گا۔ ابھی پھیر میں کچہری جا رہا ہوں۔ آج خاتمہ زمینداری بانڈ کی قسطیں مل گئیں تو فیس بھی ادا کر دوں گا۔ اور آپ کو گرم چائے اور چٹپٹی دال موٹھ بھی کھلواؤں گا" منشی جی تصور میں چائے اور دال موٹھ کا مزا لیتے ہوئے بولے پیشی کی طرف سے بے فکر رہیئے۔ عدالت پر آپ چاہے پہونچیں یا نہ پہونچیں آپ کا کام سولہ آنے کیا سوا سولہ آنے پورا ہو گا۔"

چودھری صاحب تحصیل کی کچہری پہونچے تو دیکھا کہ اسٹامپ فروش منشی چھنی لال کچہری کے پھاٹک کے پاس نیم کے درخت کے نیچے چبوترے پر بیٹھے ٹکٹوں پر جلدی جلدی خریدنے والے کا نام لکھ رہے ہیں اور زبان پر ٹکٹ رکھ کر وکالت ناموں اور درخواستوں پر چپکا رہے ہیں۔ جب چودھری صاحب قریب پہونچے تو انھوں نے اپنی ناک کی پھنگی پر رکھی ہوئی عینک کے اوپر سے دیکھا اور آداب عرض کر کے ٹکٹ خریدنے

والوں کو بقیہ دام واپس کرنے میں پھیر لگ گئے۔ منشی چنی لال اپنے اصول کے بڑے پابند تھے۔ چاہے جتنی جان پہچان ہو لیکن دام پہلے وصول کر لیتے، ٹکٹ بعد کو دیتے چودھری صاحب بھی رسمی مزاج پرسی کے بعد آگے بڑھ گئے کیونکہ بانڈ کی قسطیں لینے کے لیے انھیں اسٹامپ کی تو ضرورت تھی نہیں لیکن پھر خیال آیا کہ رسیدی ٹکٹ تو لیتے چلیں وہ تو لینا ہی پڑیں گے۔ چنانچہ انھوں نے دو رسیدی ٹکٹوں کے لیے منشی چنی لال سے کہا خیر وہ چودھری صاحب کی مروت میں یا معمولی رقم کی بنا پر پیسے ہاتھ میں پہونچے بغیر ٹکٹ صندوقچے سے نکالنے لگے مگر چودھری صاحب منشی جی کی اصول سے واقف تھے اس لیے انھوں نے ان کے ٹکٹ دینے سے پہلے ہی چونّی ان کے سامنے فرش پر ڈال دی۔ اس کے بعد چودھری صاحب منشی چنی لال کے چبوترے کے قریب تخت پر موکلوں کی تاک میں بیٹھے اور پان کھا کھا کر وقت گذاری کرنے والے ایک وکیل صاحب کی لمبی پیک سے دامن بچاتے ہوئے معاوضہ دفتر کی طرف بڑھ گئے۔

معاوضہ دفتر کی پہنچ کر انھوں نے دیکھا کہ ان کے جیسے بہت سابق زمیندار جوتوں پر سفر کی گرد جمائے اور بغلوں میں بانڈ دبائے سالانہ قسطیں لینے آئے تھے۔ ان میں سے اکثر کی قمیض

کرتے ہیں اور شیروانی بنڈھی میں تبدیلی ہو چکی تھی اور چودوایک چودھری صاحب کی طرح زیادہ وضعدار قسم کے تھے ان کی شیروانی تو نہیں بدلی تھیں لیکن ان کا رنگ روپ اتنا بدل گیا تھا کہ شیروانی کے بجائے شیروانی کا سایہ معلوم ہوتی تھیں جو پرانے خیالات کی طرح ان کے پیچھے لگا تھا ظاہر ہے کہ ان میں نہ تو سب چودھری صاحب تھے اور نہ چودھری صاحب کی طرح محتاط جو اپنی شیروانیوں کو زمانے کے جھونکوں سے بچا رہنے کے لیے ہمیشہ فنائل کی گولیوں کی چھاؤں میں احتیاط سے رکھتے۔ اپنے بھائی بندوں کی بدوضعی دیکھ کر چودھری صاحب کو برا تو ضرور معلوم ہوا لیکن جب اپنی شیروانی کے لرزتے ہوئے دامن پر ان کی نظر پڑی تو انھیں بھی ایسا محسوس ہونے لگا جیسے ان کی سکڑتی ہوئی جیب کے ساتھ ساتھ ان کی شیروانی بھی سکڑ کر بنڈھی میں تبدیل ہونے کی فکر میں ہے۔ اور وہ زبردستی اس کا دامن پکڑے ہوئے ہیں۔

لیکن یہ محض ان کا وہم تھا۔ اس میں اب کوئی نیا چولا بدلنے کی سکت نہ تھی۔ اس کا جوڑ جوڑ جواب دے رہا تھا۔ اس کا رویاں رویاں تھک کر چور ہو چکا تھا اس میں اب زیادہ زندہ رہنے کا یارانہ تھا۔ مگر وہ یہ ضرور محسوس کر رہے تھے کہ اس میں اب اتنا تنفا نہیں رہا ہے کہ وہ زیادہ دن چل سکے کئی جگہ ہوں

سے اس کا نرم جسم مسک گیا تھا تانا بانا جواب دے رہا تھا لیکن اس کے باوجود وہ چودھری صاحب کی وضع داری قائم رکھنے اور بدحالی چھپانے کے لیے اپنی خستگی کی پرواہ کئے بغیر ان کے جسم سے چمٹی ہوئی تھی۔

چودھری صاحب ابھی بانڈوں کی قسطیں وصول ہی کر رہے تھے کہ منشی جی یہ خوشخبری لے کر پہونچے کہ ڈپٹی صاحب دورے پر گئے ہیں اس لیے پیشی بڑھ گئی۔ اگرچہ چودھری صاحب

چار سال کے اندر بیسیوں بار پیشی بڑھنے کی خبر سنتے سنتے عادی نہ ہو گئے ہوتے تو یقین ہے کہ ڈپٹی صاحب کی طرح ان پر بھی دورہ پڑ جاتا کیونکہ اب یہ مقدمہ ان کے لیے گڑبھرا ہنسیا ہو گیا تھا کہ جسے نہ اگلتے بنتا تھا اور نہ نگلتے کچہری کی دوڑ لگاتے لگاتے ان کا کچومر نکل گیا تھا اور خیال ہے کہ جتنے کے بانڈ ملیں گے اس سے زیادہ وہ منشی جی کو خوش، پیشکار صاحب کو راضی اور وکیل صاحب کو مطمئن رکھنے میں خرچ کر چکے تھے۔

چودھری صاحب نے جوں توں معاوضے کی قسطیں وصول کیں اور اس بلا کو ٹالنے کے لیے جو منشی جی کی شکل میں ان کے سر پر سوار تھی فوراً وکیل صاحب کی پچھلی فیس نکال کر منشی جی کی طرف بڑھادی لیکن منشی جی وکیل صاحب کی فیس وصول کرنے کے بعد بھی ان کی

طرف بڑی دیر تک اس طرح دیکھتے رہے جیسے گرم چائے اور چٹپٹے دال موٹھ کا انتظار کر رہے ہوں۔

اس کے بعد چودھری صاحب منشی جی کو فیس دے کر اور پیشی کی تاریخ لے کر کچہری سے شہر کی طرف روانہ ہو گئے لیکن عادت کے خلاف وہ اپنے ہاتھ شیروانی کی جیبوں میں رکھنے کے بجائے اس طرح الگ لٹکائے ہوئے تھے جیسے وہ اب اس سے دست بردار ہونا چاہتے ہیں مگر بات یہ نہ تھی وہ بھلا کس دل سے اس سے جدا ہونا چاہتے چودھری صاحب یکے پر جانے کے بجائے پیدل ہی شہر جا رہے تھے۔ وہ اس وقت خیالات میں ایسے ڈوبے ہوئے تھے کہ معلوم ہوتا تھا وہ پیدل اس لیے چل رہے ہیں کہ انھیں سوچنے کا موقع زیادہ مل سکے۔ شاید وہ کوئی بڑا فیصلہ کرنے والے تھے وہ گھر لے جانے کے لیے پھل بسکٹ اور چائے وغیرہ خریدنے کے بجائے بزاز کی طرف تیزی سے بڑھ گئے عادت کے مطابق چھان بین کر کے کپڑا خریدنے کے بجائے وہ ایک تھکے ہوئے مسافر کی طرح پہلی ہی دوکان پر بیٹھ گئے اور بنڈی بنوانے کے لیے کچھ کپڑا دکھانے کو مانگا۔ کپڑا خرید کر وہ تیزی سے درزی کی دوکان کی طرف بڑھے جیسے وہ بنڈی سلوانے نہیں کفن سلوانے جا رہے ہوں۔

درزی کی دوکان پر پہونچتے پہونچتے ان کی سانس تیزی سے پھولنے لگی۔ وہ ٹیلر ماسٹر کے سلام کا جواب مشکل سے دے

پائے اور دم لینے کے لیے جلدی سے جوتا اتار کر دوکان کے کھمبے کی ٹیک لگا کر فرش پر بیٹھ گئے انھوں نے کئی بار کچھ کہنا چاہا لیکن الفاظ ان کی حلق میں کڑوے گھونٹ کی طرح اٹک کر رہ گئے وہ بار بار شیروانی کے دامن پر محبت اور حسرت سے ہاتھ پھیرتے رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد انھوں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کپڑا ماسٹر صاحب کی طرف بڑھایا اور لرزتی ہوئی آواز میں کہا کہ اس کی بنڈی سی دیجئے ماسٹر صاحب نے ایک نظر چودھری صاحب کے چہرے پر اور دوسری شیروانی پر ڈالی جو چودھری صاحب کے چہرے ہی کی طرح نڈھال تھی اور پھر کچھ سمجھ کر خاموشی سے گز اٹھانے کے لیے مڑے اتنے میں چودھری صاحب بھی گھٹنوں پر ہاتھ ٹیک کر اٹھ کھڑے ہوئے وہ کھڑے ہونے کو کھڑے تو ہو گئے لیکن ان کی سانس پھر تیزی سے پھولنے لگی اور جب ماسٹر صاحب نے شیروانی اتارنے کے لیے بٹن کھولنے شروع کیے تو چودھری صاحب کا دل بڑی زور سے دھڑکنے لگا اور ابھی پورے بٹن کھل بھی نہ پائے تھے کہ شیروانی کی جدائی سے پہلے ان کی روح ان کے جسم سے جدا ہو گئی۔

